سید امجد حسین

واقعۂ کربلا

چور مچائے شور

South Asian Freethinkers
WE DON'T WANT TO BELIEVE
WE WANT TO KNOW

واقعۂ کربلا

چور مچائے شور

سید امجد حسین

ابواب

ابتدائیہ

پیغمبر اسلام کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ "امت واحدہ" دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی جس کے پاس "مکمل ضابطہ حیات" ہونے کا دعویٰ اب بھی عام ہے۔ اصول اور قانون کی جگہ شخصیات کو ترجیح دی گئی، حالاں کہ نظریات شخصیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصول و ضوابط اور قوانین کی بنیاد پر قائم رہتے ہیں۔ نظریات کو شخصیات سے منسلک کرنا خود اس بات کی نفی ہے کہ اسلام ہر زمان و مکان کے لیے ہے۔ ایک گروپ ابو بکر کا حامی بن گیا اور ایک گروہ علی کا۔ نہ ابو بکر نے اپنی خلافت کا کوئی قرآنی اصول بیان کیا، نہ ہی علی نے؛ دونوں نے اپنے شخصی فضائل کی بنیاد پر خود کو خلافت کا اہل قرار دیا، اور نہ ہی امت کے لیے اس حساس موقع پر رہنمائی کے لیے باہمی مشاورت سے کوئی ایسا قاعدہ و قانون روشناس کرایا کہ جس سے امت ہمیشہ کے لیے ایسی صورت حال میں رہنمائی حاصل کرتی۔ اگرچہ قرآن نے ایسی صورت حال کے لیے "امرھم شوریٰ بینھم" (اور ان کا کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے) کا اصول مہیا کیا، لیکن دونوں مقدس شخصیات نے خود کو اس اصول سے بالاتر جانا، یہ ساری صورت حال ایک قبائلی چپقلش اور ذاتی مخاصمت کی آئینہ دار ہے، نہ کہ کسی ضابطہ حیات اور اصولی موقف کی۔

کیا واقعی اس انتشار کے اصحاب رسول ذمہ دار تھے؟ جی نہیں، اس کے ذمہ دار خود پیغمبر اسلام تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں کیکر کا یہ بیج بویا تھا جسے کربلا میں حسین نے کاٹا۔ کہا جا چکا ہے کہ پیغمبر اسلام کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد خلافت کے مسئلے پر اختلاف ہوا، لیکن اختلاف کس پر ہوا اور اس کا حل کیسے نکالا گیا؟ انصار صحابہ کہتے تھے کہ خلیفہ انصار میں سے ہو گا، جب کہ مہاجرین کا موقف تھا کہ خلیفہ ان میں سے ہو گا۔ اس موقع پر ابو بکر نے رسول اللہ کا فرمان سنایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا تھا کہ میرے بعد خلیفہ قریش میں سے ہو گا۔ رسول اللہ کا فرمان آ جانے کے بعد صحابہ نے اپنے مطالبات سے رجوع کیا اور رسول اللہ کے فرمان کے مطابق قریش سے خلیفہ

منتخب کیا گیا۔ پیغمبر اسلام تو انسانوں کے درمیان رنگ، نسل، خاندان، زبان کا فرق ختم کرنے آئے تھے، لیکن کیا" الائمۃمن قریش "(حکمران قریش میں سے ہوں گے) کی حدیث ان کی اپنی ہی تعلیمات کے خلاف نہیں تھی؟

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں مسلمانوں کی مستند و معتبر کتابوں کے مطابق کیا ہوا تھا؟ کس دھونس اور دھاندلی سے بیعت لی گئی، کس طرح صحابہ کی داڑھیاں نوچیں گئیں اور لوگوں پر تلوار سونت کر دہشت زدہ کر کے بیعت لی گئی۔ کیا" امرھم شوریٰ بینھم "میں صحابہ کی داڑھیاں نوچنا بھی شامل ہے؟ کیا تلوار کی نوک پر بیعت ہوتی ہے؟ طوالت کے پیش نظر صرف ایک واقعہ اس "امرھم شوریٰ بینھم "کی حقیقت کو کھولنے کے لیے کافی سمجھتا ہوں۔

زیاد بن کلیب سے مروی ہے: عمر، علی کے مکان پر آئے۔ وہاں طلحہ، زبیر، اور دوسرے مہاجر موجود تھے، عمر نے کہا، چل کر ابو بکر کی بیعت کرو، ورنہ میں اس گھر کو آگ لگا کر تم سب کو جلا دوں گا۔ زبیر تلوار نکال کر عمر کی طرف بڑھے، مگر فرش پر پاؤں الجھ جانے کی وجہ سے گر گے، اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔۔ تب دوسرے لوگوں نے زبیر پر یورش کر کے ان کو قابو میں کر لیا۔ عبد اللہ بن عبد الرحمٰن سے مروی ہے۔ "ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابو بکر کی بیعت کرنے لگے، اور قریب تھا، سعد کو روند ڈالتے۔ عمر نے کہا، اللہ اس کو ہلاک کرے اور اس کو قتل کر دو۔ سعد نے عمر کی داڑھی پکڑ لی۔ عمر نے کہا اسے چھوڑو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا۔ تو تمھارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابو بکر نے کہا عمر! خاموش رہو۔ اس موقعہ پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمر نے سعد کو چھوڑ دیا۔ سعد نے کہا، اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو مدینے کی تمام گلی کوچوں میں اپنے حامیوں سے بھر دیتا، تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ روایات کہتی ہیں، سعد نے اس کے بعد کبھی ابو بکر کی امامت میں نماز نہ پڑھی، نہ ان سے کلام کیا، ان کا انتقال بھی بہت پر اسرار انداز میں ہوا۔ (تاریخ طبری، جلد اول، صفحہ 529، اس کے علاوہ سیرت ابن ہشام اور ابن خلدون دونوں کتابوں میں متعلقہ ابواب دیکھ لیں)

ذرا تصور کر کے تو دیکھیں کہ اگر اس موقع پر حضرت زبیر کا پاؤں نہ الجھتا تو آج تاریخ اسلامی کس قدر مختلف ہوتی۔ یہ صرف ایک واقعہ تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی سات سو سالہ خلافت کی تاریخ انتقال اقتدار ایسے ہی جارحانہ اصولوں پر قائم رہی۔ اس سات سو سالہ تاریخ کا ایک اجمالی تعارف میں اپنی ایک تحریر میں پیش کر چکا

ہوں جو میری فیس بک کے وال پر محفوظ ہے۔ المختصر، عرض مدعا یہ ہے کہ حکمرانوں کو منتخب کرنے کا طریقہ تو وحی الٰہی اور نور امامت کی روشنی میں حل نہ ہو سکا، لیکن انسانی عقل و تجربے نے انسانیت کو جمہوریت سے روشناس کرایا، جس سے مغربی ممالک بڑی کامیابی کے ساتھ استفادہ کر رہے ہیں، دوسری جانب کچھ اسلامی ممالک جمہوریت اور اسلام کا ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس میں ناکامی کی وجہ سے وہ جمہوریت کو ناقابل عمل سمجھ رہے ہیں۔

تاریخ انتقال اقتدار کی وہ شرمناک روایت، جس کا آغاز پیغمبر اسلام کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہو گیا تھا، وہ اپنی انتہا پر واقعہ کربلا کی صورت میں ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا الم ناک واقعہ ہے جس نے اسلام کی چولیں ہلا ڈالیں۔

واقعہ کربلا کے موضوع پر بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں اور اس واقعہ سے جڑے تمام مختلف ہائے نظر کے فریقین نے اپنے اپنے طور پر داد سخن دینے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔ محرم الحرام کے موقع پر بہت سے واعظین اور ذاکرین رو رو کر اس واقعہ کا اسکرین پلے، ڈائیلاگ کے ساتھ کچھ اس طرح سناتے ہیں جیسے وہ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں اور باقاعدہ اس پورے واقعہ کو انھوں نے اپنے موبائل یا کیمرے میں ریکارڈ کیا ہو۔ یوں تو مسلمانوں کی پوری تاریخ جھوٹی اور گڑھی ہوئی ہے، لیکن بطور خاص اس واقعہ سے متعلق ایسا جھوٹ گڑھا گیا ہے جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں ملنی ناممکن نہ سہی، لیکن مشکل ضرور ہے۔

اس واقعہ کو تمام اولین کتب میں، جس ایک مورخ نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے؛ اس کا نام ہے ابو مخنف لوط بن یحیی۔ اس سے جو صاحب عموماً روایت کرتے ہیں، ان کا نام ہے، ہشام کلبی۔ مسلم علما ان دونوں کو متعصب مورخ کہتے ہیں، حالاں کہ ان کے تعصب کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ تاریخ طبری میں سوائے چند ایک کے، واقعہ کربلا کی تقریباً تمام روایات انھی دونوں سے مروی ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ ایک اور مورخ محمد بن عمر الواقدی ہے، جس کی بعض روایتیں واقعہ کربلا سے متعلق ہیں۔ اس مورخ کو بھی علما ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ ابن سعد، طبری سے پہلے کے مورخ ہیں، لیکن علما یہاں بھی یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ چونکہ وہ واقدی کے شاگرد ہیں، اس لیے ان کی باتوں پر بھی یقین کرنا مشکل ہے۔ واقعہ کربلا کے تعلق سے ایک اور اولین مورخ احمد بن یحیی بلاذری کو بھی علما ناقابل

اعتماد سمجھتے ہیں اور ان کے راویوں کو ضعیف اور ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ کسی بھی انصاف پسند شخص کے ذہن میں اب یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ اگر یہ تمام مورخین ناقابل اعتبار ہیں اور واقعہ کربلا کے تعلق سے ان کی اکثر روایات جھوٹی اور ضعیف ہیں تو پھر وہ کون سا منبع وہ ماخذ ہے جس سے ہم اس واقعہ کا درست احوال معلوم کر سکتے ہیں؟ مجھے افسوس ہے کہ علما کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے، اور اس لیے نہیں ہے چونکہ درج بالا مورخین کی پیش کردہ روایات ہی وہ اولین ماخذ ہیں، جن سے مسلمانوں نے خوشہ چینی کر کے اس میدان کارزار کو آراستہ کیا ہوا ہے، البتہ منافقت کا یہ حال ہے کہ اس Cherry Pick کے لیے مبتدین نے اصول بھی وضع کر رکھے ہیں، بطور مثال "واقعہ کربلا اور یزید کا کردار" نامی کتاب؛ جس کے مصنف مبشر نذیر ہیں، اس میں مندرج یہ دو نکاتی اصول ملاحظہ فرمائیں:

"ایک صورت تو یہ ہے کہ ان دونوں کی روایتوں کو چھوڑ کر دیگر روایات پر غور کیا جائے۔ اس سے جتنی معلومات حاصل ہوں، ان پر اکتفا کر کے بقیہ معاملات کو حسن ظن پر چھوڑ دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہی صحیح طرز عمل ہے۔

"دوسری صورت یہ ہے کہ ان ناقابل اعتماد مورخین کی روایات میں جہاں جہاں صحابہ کرام سے بغض ظاہر ہوتا ہو، اسے چھوڑ کر بقیہ معاملات میں ان کی باتوں کو پوری احتیاط سے قبول کیا جائے، اور ان کی کسی ایسی بات کو قبول نہ کیا جائے جس میں ان کا تعصب جھلکتا ہو اور انھوں واقعات کو جذباتی انداز میں ایسے بیان کیا ہو کہ اس دور کے مسلمانوں کی نہایت ہی بھیانک تصویر سامنے آئے۔"

ایک دوسرے فاضل محقق ابو الفوزان کفایت اللہ السنابلی صاحب اپنی کتاب "حادثہ کربلا اور سبائی سازش" میں یہی موقف اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں؛ "اگر روایات کربلا کی حقیقت و نوعیت کو سمجھ کر صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کی عظمت و فضیلت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ان روایات سے متعلق معتدل موقف یہی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے ان کا صرف وہ حصہ قبول کیا جائے جو شان صحابیت اور تابعین و اسلاف کے معیار پر پورا اترتا ہو اور ان کے مجموعی طرز عمل سے مناسبت رکھتا ہو، قطع نظر اس بات کے کہ ان کا تعلق حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب سے ہے یا یزید رحمتہ اللہ اور ان کے اصحاب سے۔" (صفحہ 24)

تو یہ تھے وہ ذرین اصول جو خود تاریخ کے اصول و مبادیات سے متصادم ہیں۔ محض اپنی خوش عقیدگی کو برقرار رکھنے کی ایسی تدبیریں مسلمانوں نے احادیث کے ضمن میں پہلے ہی وضع کر رکھی ہیں۔ موصوف کس ڈھٹائی سے فرمارہے ہیں کہ میٹھامیٹھاہپ اور کڑواکڑواتھو کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان راویوں کی وہ باتیں تو قبول کرلی جائیں جو مسلمانوں کے معتقدات کو سہارا دینے کا سبب بنتی ہیں لیکن ان روایات کو یکسر رد کر دیا جائے جو ان کے تحفظات پر ضرب پہنچاتی ہوں۔

در حقیقت روایات کربلا میں دونوں پہلو کی روایات موجود ہیں؛ ایک پہلو تو وہ ہے جس سے حسین اور ان کے اصحاب کی منقبت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یزید اور ان کے ساتھیوں کو مطعون و معتوب کرتی ہے، جب کہ دوسرا پہلو وہ ہے، جس سے حسین اور ان کے ساتھیوں پر حرف آتا ہے اور یزید اور اس کے ساتھیوں کی برات ثابت ہوتی ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ کسی ایک ہی پہلو کو منتخب کر لیا جائے اور مخالفین پر سب وشتم شروع کر دیا جائے؟

مولانا مودودی نے اپنی کتاب "خلافت وملوکیت" میں اسی جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے، جس کے جواب میں حافظ صلاح الدین یوسف نے لکھا ہے؛ "ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمام نکتہ سنجیاں محض انھیں روایات کو صحیح باور کرانے کے لیے کیوں ہیں، جو حضرت عثمان اور حضرت معاویہ کو مجرم گردانتی ہیں؟ یہ نکتہ سنجیاں آخر ان تاریخی روایات کی صحت کے لیے کیوں نہیں ہوسکتیں جو حضرت علی و حسین کے کردار کو بھی مجروح کرتی ہیں؟" (خلافت و ملوکیت کی شرعی حیثیت، صفحہ 163)

یہ ضرور ہے کہ اس واقعہ کے تعلق سے بطور خاص شیعوں نے نسبتاً زیادہ گل افشانیاں کی ہیں، مبالغہ آرائیوں اور جھوٹی داستانوں سے اپنی من گھڑنت تاریخ کو سرخ سرخ کر کے رکھ دیا۔ شیعیت پیغمبر اسلام کے ساتھ ساتھ فاطمہ، علی، حسن اور حسین اور اپنے دیگر آئمہ کو بھی "عصمت" کے درجہ پر فائز کرتی ہے، نتیجتاً ان کے نزدیک ان حضرات سے بھول چوک کا تصور بھی محال ہے، جب کہ ان سے اختلاف کرنے والا لازماً گناہگار ہوگا۔ اگرچہ اہل سنت بطور عقیدہ اس بات کو نہیں تسلیم کرتے لیکن ان کا ذہنی رویہ اسی طرف مائل ہے۔ ابو بکر کے زمانے سے عثمان کے دور تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی رکاوٹیں انھیں اس رویے کا اظہار کی اجازت نہیں دیتیں، لیکن اس

دور کے ختم ہوتے ہی جب نیا دور شروع ہوتا ہے تو اہل سنت کے اس رویہ کا اظہار شروع ہو جاتا ہے جو شیعوں کے ہاں عقیدہ کا درجہ رکھتا ہے۔ علی اور معاویہ کے اختلاف کی کہانی میں اہل سنت بھی انصاف پسندی کے قائل نہیں بلکہ وہ معاویہ کو صرف کچھ رعایت بمشکل دیتے ہیں، لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اس کے اور حسین کے معاملے میں سنیوں اور شیعوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اگلوں کی کے تقدس و احترام کے نام پر علم و تحقیق کا دروازہ بند کرنے والا یہ طرز فکر اگر مسلمانوں میں عام نہ ہوتا تو شاید آج کا حال مختلف ہوتا۔

المختصر، واقعہ کربلا کے تعلق سے ہمیں تین مختلف موقف نظر آتے ہیں:

1۔ خلافت؛ علی اور ان کی اولاد کا حق تھا، لیکن چونکہ یزید نے اس پر غاصبانہ قبضہ کیا، اس لیے حسین نے اپنے حق کے حصول کے لیے جدوجہد کی اور شہید ہوئے۔

2۔ حسین کی حیثیت ایک باغی کی سی تھی، اس لیے یزید کی فوج حسین کو شہید کر کے ایک جائز اقدام کیا۔

3۔ حسین باغی نہیں تھے بلکہ ان کی شہادت ایک مظلومانہ شہادت ہے۔

ہم اس گفتگو میں ان تینوں موقف کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے لیکن ہمارے نزدیک کچھ مزید سوالات اہم ہیں جن کا تاریخی حوالوں سے محاسبہ ضروری ہے، مثلاً:

- حسین کے اقدام کی نوعیت کیا تھی؟
- واقعہ کربلا کے محرکات کیا تھے؟
- واقعہ کربلا کا ذمہ دار کون تھا؟
- دیگر صحابہ کا حسین کے خروج پر کیا ردعمل تھا؟
- اس واقعہ کے تناظر میں یزید کا کردار کیا تھا؟
- کیا حسین بن علی، یزید بن معاویہ کے مقابلہ میں استحقاق خلافت زیادہ رکھتے تھے؟

ان سوالوں کے علاوہ کئی ضمنی سوالات ہیں، جو دوران بحث شامل ہوتے جائیں گے۔ ہم اس گفتگو میں دونوں طرف کی روایتوں کو دلائل اور تاریخی حقائق کی کسوٹی پہ پرکھنے کی کوشش کریں گے۔

سید امجد حسین / 30 ستمبر 2017

پس منظر

واقعہ کربلا، غزوہ بدر کی طرح سیدھا سادہ واقعہ نہیں ہے بلکہ اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں، اور یہ پیچیدگیاں تاریخ کے تضادات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور یہ تضادات مسلمانوں کے مختلف مکاتیب فکر کے زاویہ ہائے نظر کے سبب ہیں۔ ہر مکتب فکر اس معاملے میں خود کو صادق اور مخالفین کو کذاب قرار دیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر فریق اس بابت اپنے دعوے اور الزام تراشیاں مدلل اور بحوالہ پیش کرتا ہے۔ ایسے میں کسی غیر جانب دار شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس خس و خاشاک کے ڈھیر سے وہ سوئی کیسے تلاش کرے جس سے اصل حقیقت کی رفوگری کا کام انجام پاسکے۔

واقعہ کربلا کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک اس کا پس منظر نہ سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ طوالت کے پیش نظر اس کا یہاں موقع نہیں ہے کہ اس پس منظر کو یہاں تفصیلاً رقم کیا جائے، لیکن اس کا اجمالاً ذکر ناگزیر ہے۔ اس پس منظر کی شروعات خود پیغمبر اسلام کی حیات میں ہو گئی تھی، اس لیے انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جوالہ مکھی زیر زمین کیسے اُبل رہا ہے جو کبھی نہ کبھی ضرور پھٹے گا۔

"میری امت میں جب ایک دفعہ آپس میں تلوار کھنچ جائے گی تو پھر وہ قیامت تک رکھی نہ جائے گی۔" (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، فصل ثانی، بحوالہ ابو داؤد، ترمذی)

قتل عثمان اور خانہ جنگی

چنانچہ، خلیفہ سوم عثمان کی شہادت (35ھ) سے مسلمانوں کی تلواریں جو بے نیام ہوئیں، وہ آج تک واپس اپنے نیام میں نہیں گئیں۔ یہ تلوار آپس میں چلی اور ایسی چلی کہ شہادت عثمان کے بمشکل ایک سال بعد ہی مسلمانوں

نے آپس میں دو جنگیں؛ جنگ جمل اور جنگ صفین کے نام سے لڑیں، جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمانوں قتل کر دیے گئے۔ دونوں جنگوں کے مقتولین کی تعداد 83 ہزار بتائی جاتی ہے۔ چونکہ مسلمانوں کے ہاں اپنی اور اپنے اکابرین کی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی کوئی روایت سرے سے موجود نہیں ہے، لہٰذا حقائق کی پردہ پوشی کے لیے وہ ان دونوں جنگوں کو بھی سبائی اور یہودی سازش قرار دے کر خود کو مظلوم و معصوم بنانے کی اکثر کوشش کرتے رہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عثمان کے قتل کے بعد پورے ملت اسلامیہ میں "انتقام انتقام، قصاص قصاص" کی آوازیں گونجنے لگیں لیکن علی نے قصاص نہیں لیا اور نہ قصاص لینے کا ان میں کوئی ارادہ ہی نظر آتا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا، "دوسرے یہ کہ قصاص لینا حق ہے اور حضرت مرتضیٰ اس پر قادر تھے کہ حضرت ذی النورین (عثمان) کا قصاص لے سکتے لیکن انھوں نے قصاص نہ لیا بلکہ اس کے مانع ہوئے۔ حضرت مرتضیٰ نے بھی خطائے اجتہادی سے کام لیا۔" (ازالتہ الخفا عن خلافتہ الخلفا، جلد دوم، صفحہ 279)

مسلمان اپنے اکابرین کی خطائے صریح کے لیے "خطائے اجتہادی" کا استعمال کرکے انھیں رخصت دیتے ہیں، جب کہ دوسرے محققین نے اسے مجبوری، بے بسی، حکمت علمی وغیرہ جیسے الفاظ سے علی کا دفاع کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ بہر حال، بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ صورت حال واضح تھی کہ: "تینوں خلفا (ابو بکر، عمر، عثمان) نے پوری امت کو اپنی (خلافت) پر مجتمع کر لیا تھا اور اس طرح انھیں امامت (خلافت) کا مقصود حاصل ہو گیا تھا اور ان کی اس امارت کے مسلم ہونے کی وجہ سے انھوں نے کفار پر جہاد کیا اور شہروں کو اپنے اقتدار کے تحت لے آئے اور علی کی خلافت میں نہ کفار سے جہاد ہوا اور نہ شہر فتح ہوئے۔ اس دور میں بس تلوار اہل قبلہ ہی میں چلتی رہی۔" (منہاج السنتہ، جلد اول، صفحہ 145)

علی ابن طالب کی غیر آئینی خلافت

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ایک مستشرق نے بھی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "حقیقت یہ ہے کہ علی کو عثمان کی جانشینی کا حق بالکل حاصل نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی واضح ہے کہ تقدس وپارسائی کا جذبہ تو ان کے طلب

خلافت میں کار فرمانہ تھا بلکہ حصول اقتدار و حب جاہ کی ترغیب تھی۔ اس لیے معاملہ فہم لوگوں نے، اگرچہ وہ عثمان کے طرز حکمرانی کی مذمت کرتے تھے، لیکن انھوں نے علی کی جانشینی تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ " (گیارھواں ایڈیشن، جلد پنجم، صفحہ 20)

لہٰذا مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے ان سے بیعت نہیں کی۔ اکابر صحابہ کی اکثریت نے بھی بیعت کرنے سے گریز کیا، مثلاً عبد اللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، اسامہ بن زید، حسان بن ثابت، زید بن ثابت، کعب بن مالک، رافع بن خدیج، ابو سعید الخذری، مسلمہ بن مخلد، محمد بن مسلمہ، نعمان بن بشیر، فضالہ بن عبید، کعب بن عجرۃ، صہیب رومی، سلمہ بن دقش، قدامہ بن مظعون، عبد اللہ بن سلام، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ۔ (طبری) قصاص کے طالبین میں جو اہم نام شامل تھے، یعنی طلحہ، زبیر اور خود ام المومنین عائشہ کے اقوال شاہ والی اللہ محدث دہلوی نے "ازالتہ الخفاعن خلافتہ الخلفا"، جلد دوم، صفحہ 279" میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے؛

"خلافت حضرت مرتضیٰ کے لیے قائم نہ ہوئی، کیوں کہ اہل حل وعقد نے اپنے اجتہاد سے اور مسلمانوں کی نصیحت کی غرض سے بیعت ان سے نہیں کی۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی علی کی بیعت کے متعلق یہی لکھا ہے، "پس مسلمانوں کی کثیر تعداد نے یعنی نصف نے یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ نے ان کی (علی کی) بیعت نہیں کی، نہ سعد بن ابی وقاص نے بیعت کی اور نہ (عبد اللہ) بن عمر نے اور نہ دوسرے (صحابہ) نے۔" (منہاج السنتہ، جلد دوم، ص 237)

باپ کو ایک دور اندیش بیٹے کی نصیحت

المختصر، علی کی خلافت قائم نہ ہو سکی اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سوائے کوفہ اور اس کے آس پاس کے کچھ علاقوں کے سوا ان کی حکومت باقی نہ رہی، نتیجتاً خانہ جنگی کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ دوسری جانب معاویہ شام کی گورنری پر 15 سال سے مقرر اور فائز تھے، جسے علی نے خلیفہ بننے کے بعد قبول نہیں کیا۔ دوسروں کو جانے دیجیے، خود علی کے بیٹے حسن نے اپنے باپ کی مقابلہ آرائی کی پالیسی سے اختلاف کیا اور انھیں معاویہ سے صلح کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب علی نے ان لوگوں سے لڑنے کا عزم کیا، جنھوں نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی، تو

آپ کے صاجزادے حسن نے آپ کو روکنے کی کوشش کی؛ "اباجان! اس ارادے کو ترک فرمادیجیے۔ اس میں مسلمانوں کی خونریزی ہوگی اور ان کے مابین اختلاف ہوگا۔ حضرت علی نے یہ رائے قبول نہیں کی اور لڑنے کے عزم پر قائم رہے اور لشکر کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔" (البدایہ والنہایہ)

حسن نے اس وقت بھی اپنے باپ کی مخالفت کی، جب علی جنگ جمل کے لیے روانہ ہوئے۔ حسن نے انھیں راستے میں روک کر کہا، "میں نے آپ کو منع کیا تھا لیکن آپ نے میری بات نہ مانی، کل کو آپ اس حالت میں قتل کر دیے جائیں گے کہ کوئی آپ کا مددگار نہ ہوگا۔ حضرت علی نے کہا؛ تُو تو مجھ پر ہمیشہ اس طرح جزع فزع کرتا ہے جیسے بچی جزع فزع کرتی ہے، تو نے مجھے کس بات سے منع کیا تھا جس میں، میں نے تیری نافرمانی کی؟ حضرت حسن نے کہا؛ کیا قتل عثمان سے پہلے میں نے آپ کو نہیں کہا تھا کہ آپ یہاں سے نکل جائیں تاکہ آپ کی موجودگی میں یہ سانحہ نہ ہو، تاکہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے؟ کیا قتل عثمان کے بعد میں نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ اس وقت تک لوگوں سے بیعت خلافت نہ لیں جب تک ہر شہر کے لوگوں کی طرف سے آپ کے پاس ان کی بیعت کی اطلاع نہ آجائے؟ اور میں نے آپ کو یہ بھی کہا تھا کہ جس وقت یہ خاتون (عائشہ) اور یہ دو مرد (طلحہ اور زبیر) قصاص عثمان کا مطالبہ لے کر نکلیں تو آپ گھر میں بیٹھے رہیں، یہاں تک کہ یہ سب باہم صلح کرلیں۔ لیکن آپ نے ان سب باتوں میں میری نافرمانی کی۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 7، صفحہ 245)

پھر جب جنگ جمل شروع ہوگئی اور مسلمان ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے تو اسی علی بن طالب نے اپنے بیٹے حسن سے اعتراف کیا کہ، "بیٹے! کاش تیرا باپ اس دن سے 20 سال قبل مر گیا ہوتا۔" جواب میں لائق بیٹے نے کہا، "اباجان! میں تو آپ کو اس سے منع ہی کرتا رہا۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 7، صفحہ 251)

حسن ابن علی کے علاوہ علی کے سگے بڑے بھائی عقیل اپنے بھائی سے علیحدہ ہو کر ان کے مدمقابل معاویہ کے پاس چلے گئے، یہ بھی قصاص عثمان کے طالب تھے۔ صفین کے میدان میں وہ بھی معاویہ کے ساتھ ہی ڈٹے رہے۔ خود شیعہ مورخ نے بھی اس بات کو کچھ ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے، "اور (عقیل) اپنے بھائی امیر المومنین سے ان کے ایام خلافت میں جدا ہوگئے اور معاویہ کے پاس بھاگ گئے اور ان ہی کے ساتھ صفین کی جنگ میں موجود رہے۔" (عمدۃ الطالب، صفحہ 15)

ایک ناکام خلیفہ کا اعتراف شکست اور قتل

بہر حال علی کے احساس برتری اور ہٹ دھرمی؛ جو خلاف جمہور کے علاوہ قرآنی ضابطہ "امرھم شوریٰ بینھم "(اور ان کا کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے) سے بھی صریح متصادم تھا، نے جب ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا تو خون عثمان کے قصاص کا مسئلہ ثالثی کے سپرد کر دیا۔ افسوس، "شہر علم" کے دروازہ علی ابن طالب کے عقل سلیم نے بڑی سست رفتاری دکھائی، حتیٰ کہ جب تک ہزاروں مسلمانوں کی گردنیں ان کے شانوں سے جدا نہ ہو گئیں اور مورخ وقت نے ان بے گناہوں کے خون سے تاریخ رقم نہ کر دی۔ بہر حال، ثالثوں نے اتفاق رائے سے علی کو منصب خلافت سے معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد کے مشورے پر چھوڑ دیا اور طے یہ پایا کہ جب تک انتخاب خلیفہ کی کاروائی مکمل نہ ہو، فریقین اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں پر قائم رہیں۔ مورخین کے مطابق صفین کی واپسی کے بعد علی اپنے ہی حمایتیوں کے ایک گروہ سے قتال و جدال میں الجھ گئے، حتیٰ کہ عبدالرحمٰن بن ملجم نے علی کو زہر آلود خنجر سے زخمی کر دیا اور تین روز جان کنی کی کیفیت میں زندہ رہنے کے بعد وفات پا گئے۔

اپنی عبرت ناک شکست اور ناکامی کے پیش نظر علی نے ان آخری تین دنوں میں اپنے بیٹے کو وصیت کی، "میرے مرنے کے بعد معاویہ سے فوراً صلح کر لینا اور ان کے امیر المومنین ہو جانے سے کراہت مت کرنا۔"(البدایہ والنہایہ، جلد8، صفحہ 31)

علی کی یہ وصیت دراصل ان کے تجربے پر مبنی تھی، وہ سمجھ چکے تھے کہ سیاست و نظام حکومت کی زمام کار کا صحیح حقدار نسبی فضیلت کی بنا پر نہیں بلکہ اس سے سوا صلاحیتیں رکھنے والا ہوتا ہے اور یہ اہلیت اس وقت معاویہ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ معاویہ کی 20 سالہ دور خلافت میں اسلامی قلمرو اندرونی شورشوں سے محفوظ رہی اور اس اسلامی فتوحات کا سلسلہ جو علی کے پانچ سالہ دور میں بند رہا، پھر سے جاری ہو گیا۔

حسین ابن علی کے عزائم

باپ کی وفات کے بعد حسن ابن علی نے بلا تاخیر صلح و مصالحت میں سبقت کی اور معاویہ سے بیعت کر لی۔ کچھ ثقہ راویوں نے کہا ہے کہ حسین جن کا مزاج اپنے بڑے بھائی سے یکسر مختلف تھا، انھوں نے حسن کے اس فیصلے کی

مخالفت کی لیکن انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین کو ڈانٹ کر چپ کرا دیا، "تم چپ رہو، میں اس معاملہ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 62)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی تالیف "علی و بنوہ" میں اس واقعہ کو زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، "حسین بن علی نے اپنے بھائی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور صلح و امن کی طرف ان کے میلان کو نہیں مانا۔ انھوں نے اپنے بھائی پر لڑائی میں چلنے کو زور دیا لیکن ان کے بھائی نے منع کیا اور ڈرایا کہ اگر میری اطاعت نہ کی تو بیڑیاں پہنا دی جائیں گی۔" (صفحہ 203)

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ حسین کا مزاج اپنے بڑے بھائی سے یکسر مختلف تھا، لہٰذا ان کی پالیسی اور اقدامات کے نتائج بھی ہولناک ثابت ہوئے جس کی طرف ہم رفتہ رفتہ بڑھ رہے ہیں۔ مختصر میں اگر ہم حسین کے مزاج کا تجزیہ تاریخی حوالوں کی روشنی میں کریں تو ہمیں ان میں کم از کم تین واضح رویے بخوبی نظر آ جاتے ہیں:

- اپنے برتر ہونے کا احساس۔
- اختلاف کی راہ اپنانے پر اصرار۔
- باغیوں کو اپنے مفادات و مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی کوشش۔

حسین کا باغیانہ رویہ

حسین کا احساس برتری انھیں وراثت میں ملا تھا اور درست بھی تھا لیکن انھیں اپنے والد علی کے انجام سے حسن کی طرح سبق لینے کی ضرورت تھی۔ حسین نے اس عریاں حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ حکومت و اقتدار کی تاریخ کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں فضائل کم دیکھے جاتے ہیں اور دوسرے عوامل زیادہ۔ علمائے سیاست میں سے کسی نے بھی خلافت و حکومت کی اہلیت کے لیے افضلیت کے معیار کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے ہٹ کر الگ معیارات کو بنیاد بنایا۔ اگر افضلیت معیار ہے تو پھر تاریخ اسلامیہ کے اکثر خلفا و سلاطین نااہل قرار پائیں گے۔ امور جہانبانی کا مسئلہ اپنی گوناگوں نوعیت اور وسعت کے اعتبار سے مختلف حیثیت رکھتا ہے، جس کی ایک مثال تو خود علی اور معاویہ تھے۔ علی بے شک نسبی فضیلت کے اعتبار سے معاویہ سے برتر تھے لیکن ان کا دور حکومت معاویہ کے دور کے مقابلے میں کس

انتشار کا شکار رہا، وہ اظہر من الشمس ہے۔ افسوس، حسین نے اپنے والد کے تجربے سے استفادہ نہیں کیا اور اپنے والد کی طرح احساس برتری اور نسبی تفاخر میں مبتلا رہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے حمایتیوں سے برملا کہا؛

"تم سب لوگ اس وقت تک اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے رہو، جب تک یہ (معاویہ) زندہ ہیں۔" (الاخبار الطوال) اس کے علاوہ "الامامتہ والسیاستہ" کے مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حسین نے کوفی لیڈر سلیمان بن صرو کو یہی جواب دیا؛ "لیکن تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کے اندر خاموشی سے اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک کہ معاویہ زندہ ہیں، کیوں کہ ان کی بیعت میں نے واللہ بکراہت کی، پس اگر معاویہ وفات پا گئے تو ہم بھی غور کریں گے اور تم بھی، ہم بھی رائے قائم کریں گے اور تم بھی۔" (صفحہ 173)

ان سب راویوں سے کہیں زیادہ ابو مخنف کا حوالہ اہم ہو جاتا ہے جو واقعہ کربلا کا اکلوتا بنیادی ماخذ ہے، اس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ بہر حال، حسین کی معاویہ سے بکراہت بیعت کا تذکرہ خود حسین کی زبانی بعد حمد و ثنا کے ہمیں ابو مخنف کی "مقتل الحسین" میں یوں مل جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"بخدا میں موت پر دل سے راضی تھا تا آنکہ میرے بھائی حسن نے مجھ پر زور دیا اور خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ میں کوئی اقدام نہ کروں اور نہ سکون میں کسی تلاطم کا سبب بنوں۔ اس لیے میں نے ان کی بات مان تو لی، مگر لگتا ایسا ہے کہ جیسے کوئی کاٹنے والا چھریوں سے میری ناک کاٹ رہا ہو، یا نشتر سے میرا گوشت چھید رہا ہو۔ گویا میں نے جو ان کی بات مانی ہے تو مجبوراً۔ اور اللہ فرماتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تمھیں کوئی بات ناگوار لگے اور وہ ہو تمھارے حق میں بہتری کی، اور ہو سکتا ہے کہ کوئی بات تم پسند کرتے ہو مگر وہ تمھارے حق میں بری، کیوں کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اب چونکہ صلح ہو گئی ہے اور بیعت کر لی گئی ہے، اس لیے ہمیں اس وقت تک کا انتظار کرنا چاہیے جب تک یہ شخص (معاویہ) موجود ہے۔ جب یہ مر جائے گا تو ہم بھی دیکھیں گے اور تم بھی دیکھو گے۔"

گویا، حسین پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ امیر المومنین معاویہ کے مرنے کے بعد وہ اپنے سیاسی موقف کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ اس جگہ اہل سنت ابو مخنف سے اختلاف کرتے ہوئے اسی شیعہ اور رافضی قرار دیتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ کئی مقام پر اسی رافضی اور شیعہ راوی سے اتفاق کرتے ہوئے اسی کا حوالہ بھی دیتے ہیں چونکہ مجبوری یہ ہے کہ اس واقعہ کا سب سے قدیم ماخذ یہی ہے، جس سے ابن سعد، طبری، واقدی، ابن کثیر اور دوسروں نے استفادہ

کیا۔ دوسری جانب شیعوں کا یہ حال ہے کہ وہ ابو مخنف کے بیشتر حوالوں کو اپناتے ہیں لیکن جہاں جہاں اپنے موقف کے خلاف روایات پاتے ہیں، وہاں وہاں وہ یہ الزام دھر جاتے ہیں کہ ابو مخنف کی بیان کردہ روایت تحریف شدہ ہے۔

معاویہ کی صلہ رحمی اور حسین کی منافقت

بہر حال، حسین کے اس منافقانہ رویہ کے بر خلاف معاویہ کا یہ حال تھا کہ ان کے دور خلافت میں علی کے ان دونوں صاجزادوں یعنی حسن و حسین کے ساتھ بڑی محبت و عزت کے ساتھ بر تاؤ ہو تا رہا اور یہ دونوں ہر سال بلاناغہ امیر المومنین معاویہ کی خدمت میں دمشق جاتے اور مال بٹورتے رہے۔ اگرچہ مجھے طوالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں اس بابت حوالوں کے ڈھیر لگادوں لیکن ان میں سے کچھ حوالے محض اس لیے پیش کر رہا ہوں تاکہ مجھ پر کذب بیانی کا الزام نہ دھر دیا جائے، ملاحظہ ہو:

"جب خلافت معاویہ کی قائم ہو گئی تو حسین اپنے بھائی حسن کے ساتھ ان کے پاس جایا کرتے تھے اور وہ ان دونوں کی بہت زیادہ عزت کرتے اور مرحبا کہتے اور عطیات دیتے، ایک ہی دن میں انھیں دو لاکھ درہم عطا کیے۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 150)

ایک دوسری جگہ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں؛

"حسن بن علی، معاویہ کے پاس (دمشق) آئے تو ان سے فرمایا کہ میں تم کو ایسا (گرانقدر) عطیہ دوں گا جو مجھ سے قبل کسی نے نہیں دیا ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے چار لاکھ کی رقم دی، پھر جب ایک دفعہ حسن و حسین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان دونوں حضرات کو انھوں نے فی الفور دو دو لاکھ دیے۔" (ایضاً، صفحہ 137)

شرح نہج البلاغتہ میں بھی ان عطیات کا ذکر موجود ہے، شارح کہتا ہے؛

"اور معاویہ دنیا میں پہلے شخص تھے جنھوں نے دس دس لاکھ درہم عطا کیے اور ان کے فرزند (یزید) پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس کو دوگنا کر دیا اور یہ عطیات علی کے ان دونوں بیٹوں حسن و حسین کو ہر سال دس دس لاکھ درہم کے عطا ہوتے اور اسی طرح عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن جعفر کو بھی دیے جاتے۔" (جلد دوم، صفحہ 823)

حسن کی وفات کے بعد بھی حسین باقاعدگی سے معاویہ سے یہ عطیات وصولتے رہے (دیکھیے، البدایہ و النہایہ)، اتنا ہی نہیں بلکہ جس ابو مخنف کو شیعہ راوی اور رافضی کہا جاتا ہے، اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ معاویہ ہر سال حسین کو ایک لاکھ درہم بھیجا کرتے تھے (مقتل الحسین، صفحہ 7)۔

قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک طرف صلہ رحمی تھی اور دوسری طرف اندر ہی اندر نفرت کا وہ لاوا جو پھٹنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ معاویہ کو حسین کی موقع پرستی اور ان کی سرگرمیوں کی اطلاع نہیں تھی، انھوں نے ایک خط حسین کے پاس بھیج کر اس بابت پوچھ تاچھ بھی کی تھی:

"امابعد، مجھے تمھارے بارے میں کچھ باتیں پہنچی ہیں اور ایسے احوال مجھ تک آئے ہیں جنھیں میں غلط سمجھ رہا ہوں۔ اپنی قسم یہ باتیں جو تمھارے متعلق پہنچی ہیں ان کے بارے میں اگر وہ سچ ہیں جو میں نے سمجھ رکھا ہے تو اپنی سعادت مندی اور عہد الٰہی کی پاسداری میں تم اس سے کہیں زیادہ ہو۔ لہٰذا مجھے اپنے سے قطع تعلق کرنے پر مجبور نہ کرنا۔ تم نے اگر مجھ سے کوئی چال چلی تو میں بھی تم سے چال چلوں گا، اور اگر تم نے میرا احترام کیا تو میں بھی تمھارا احترام کروں گا۔ امت کی یکجہتی کو مت توڑنا، تمھیں خود ہی ان لوگوں (حمایتیوں) کا تجربہ ہے اور ان کا امتحان کر چکے ہو۔ لہٰذا اپنی جان اور اپنے دین کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ نا سمجھ لوگ جو معاملات کا فہم نہیں رکھتے، وہ تمھیں ورغلا لیں۔" (مقتل الحسین المعروف مقتل ابی مخنف، صفحہ 55)

ظاہر ہے کہ اس خط سے حسین کے پاؤں تلے زمین نکل گئی ہو گی، جو عطیات کا ایک آسرا تھا، وہ ہاتھوں سے جاتا دکھائی دیا اور سب سے بڑی بات وہ معاویہ جیسے طاقتور خلیفہ سے کسی قسم کا معارضہ کرنے کی حالت میں اس وقت خود کو نہ پاتے تھے، لہٰذا انھوں نے "تقیہ" کا سہارا لیتے ہوئے اس خط کا جواب یوں لکھا؛

"مجھے آپ کا خط مل گیا اور جو کچھ آپ نے ذکر کیا، میں اس کو سمجھ گیا۔ میں اللہ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ جو عہد میرے بھائی حسن نے آپ سے کیا تھا، اسے میں توڑ دوں۔ باقی باتیں جو آپ نے لکھی ہیں تو یہ آپ کو دروغ گوؤں نے پہنچائی ہیں، جو چغلی کھانے والے اور جماعت میں تفرقہ ڈالنے والے ہوا کرتے ہیں۔ بخدا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔" (ایضاً)

اس جوابی خط سے شاید معاویہ مطمئن ہو گئے یا خاموش رہے، اور عطیات کا سلسلہ بر قرار رکھا۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حسن بن علی کو زہر دے کر مارا گیا، جب کہ اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور ابو مخنف کے وقت تک ایسی کوئی بات مسلمانوں میں معروف نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو ابو مخنف اس کا ذکر ضرور کرتا، چونکہ بقول اہل سنت وہ شیعہ راوی ہے تو بھلا ایسا موقع وہ کیوں جانے دیتا؟

سبائی سازش کا شگوفہ

شہادت عثمان سے لے کر شہادت حسین تک کے دور کو اکثر مورخین و مبصرین "سبائی سازش" کے زیر تسلط قرار دیتے ہیں۔ بطور خاص اہل سنت کا اس بات پر اصرار ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو بھی سیاسی انتشار نظر آتا ہے، ان سب کی پس پشت سبائی سازش کارفرما رہی ہے، حتیٰ کہ خلیفہ دوم عمر فاروق کی شہادت بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ لفظ "سبائی" کو ایک نام "عبداللہ بن سبا" سے جوڑا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شخص ایک یہودی تھا، جو صنعا (یمن) کا رہنے والا تھا جس نے عثمان کے زمانہ میں بظاہر اسلام قبول کیا، لیکن خفیہ طور پر مسلمانوں کے درمیان اختلاف و افتراق پھیلانے میں مصروف رہا اور مسلمانوں کے مختلف بڑے شہروں جیسے شام، کوفہ، بصرہ اور مصر کا سفر کر کے مسلمانوں کے اجتماعات میں شرکت کرتا رہا اور ان کے اندر نفاق کے بیج بوتا رہا۔ تاریخ نویس مزید کہتے ہیں، چونکہ یہودیوں کا اقتدار، اسلام کے پھیلنے سے ختم ہو گیا تھا، سو ابن سبا نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے علی کے وصیؑ رسول ہونے کا اعلان کیا اور تینوں خلفا (ابو بکر، عمر اور عثمان) کو غاصب قرار دیا، بنو امیہ اور بنو ہاشم کی چپقلش کو ہوا دی۔ شیعہ مذہب کی بنیاد رکھی، علی اور ابنِ ابی سفیان کو آپس میں لڑایا۔ پہلے اپنی سازش عراق و مصر و یمن میں پھیلائی، پھر ایران تک اس نے اپنا دائرہ وسیع کیا۔ ایران چونکہ عمر فاروق کے دور میں فتح ہوا تھا، اس لیے ایرانیوں نے اس کی دعوت کو سر آنکھوں پر لیا اور یوں وہ عالم اسلام کا شیرازہ منتشر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گویا عبداللہ بن سبا کوئی آدمی نہیں "سپر مین" تھا، جس نے صدر اسلام کے جید اور مقتدر صحابہ کی موجودگی میں اتنے سارے کام انجام دیے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی، شاید اس نے جادو ٹونا کر کے سبھی کے عقل ماؤف کر دیے ہوں گے۔ یہ کہانی اہل سنت سناتے ہیں۔ اب ذرا آیئے دیکھتے ہیں کہ اس کہانی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ عبداللہ بن سبا کون تھا؟ تھا بھی یا نہیں؟

عبد اللہ بن سبا کی حقیقت

جب آپ اس کردار کا سراغ لگانے نکلیں گے، تو یہ دیکھ کر حیران ہو جائیں گے کہ جن جن لوگوں سے اس شخص یعنی عبد اللہ بن سبا کو جوڑا جاتا ہے، ان میں سے کسی کی زبان پر اس کا نام نہیں ہے، حتیٰ کہ خلیفہ سوم عثمان سے ایک ضعیف روایت تک اس کے بارے میں منقول نہیں ہے۔ معاویہ ابن سفیان کی زبان پر بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اگر یہ شخص واقعی یہودی تھا جس نے بظاہر اسلام کا لبادہ صرف مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے اوڑھ رکھا تھا تو پھر اسے علی کے خیمے میں نہیں ہونا تھا بلکہ ان کے مخالفین کے لشکر میں شامل ہونا تھا، چونکہ علی نے تو خیبر کے یہودیوں کا قلع قمع کیا تھا؟ اس دور کے اجل مورخین ابن شہاب زہری، عروہ بن زبیر، ابان بن عثمان، ابو بکر ابن حزم، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

ابن سبا کا نام سب سے پہلے ہمیں "تاریخ طبری" میں نظر آتا ہے، یعنی سب سے پہلے طبری نے اس داستان کو اپنی کتاب میں نقل کیا اور بقیہ تمام مورخین و مولفین نے تاریخ طبری سے نقل کرکے اپنی کتابوں میں اس داستان کو جگہ دی ہے۔ اس داستان کا راوی اول صرف اور صرف "سیف بن عمر تمیمی" ہے جسے متفقہ طور پر یحییٰ بن معین (متوفی 233ھ)، نسائی (متوفی 303ھ)، ابو داؤد (متوفی 275ھ)، ابن حماد عقیلی (متوفی 323ھ)، ابن ابی حاتم (متوفی 327ھ)، ابن سکن (متوفی 253ھ)، ابن حبان (متوفی 354ھ)، صاحب قاموس فیروزآبادی (متوفی 817ھ)، محمد بن احمد ذہبی (متوفی 748ھ)، ابن حجر (متوفی 852ھ)، علامہ سیوطی (متوفی 911ھ)، صفی الدین (متوفی 923ھ) جیسے علمائے رجال نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ یہ راوی یعنی سیف بن عمر تمیمی ضعیف، دروغ گو، غیر معتبر، اور زندیق ہونے کا ملزم ہے لہٰذا اس کی روایتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی راوی کے بارے میں دو یا تین علمائے رجال بھی لکھ دیں کہ یہ معتبر نہیں ہے، تب بھی اس کی روایت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہاں تو پوری جماعت عبد اللہ ابن سبا کی داستان کے راوی کو جھوٹا اور ضعیف کہہ رہی ہے۔ اس کے بعد بھی اس داستان پر یقین کر لینا سمجھ سے باہر ہے۔

مزید گہرائی میں جانے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نام اور کردار کا کوئی شخص پیدا ہی نہیں ہوا۔ سیف بن عمر نے صرف عبد اللہ ابن سبا کا ہی افسانہ نہیں گھڑا، بلکہ گروہ "سبائی" بھی وضع کیا اور اس کو مذہبی رنگ دے کر

ابن سبا سے نسبت دی ڈالی۔ ابن سبا اور سبائیوں کے بارے میں جنوبی لبنان کے محقق علامہ مرتضیٰ عسکری نے تہران میں اس پر تحقیق کی اور انھوں نے لفظ 'سبائی' یا 'سبیئہ' کے تین استعمال تحریر کیے ہیں۔ پہلا استعمال اپنے اصلی اور حقیقی معنی میں ہے یعنی یمن کا قحطانی قبیلہ 'سبائی' کہا جاتا تھا اور اس سلسلے میں سمعانی (متوفی 562ھ)، ابو بکر حازمی ہمدانی (متوفی 584ھ)، ترمذی، صاحبِ لسان العرب، یاقوت حموی، ابن جزم (متوفی 456ھ)، ابن خلدون (متوفی 808ھ) وغیرہ نے اپنی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے کہ یمن کے قحطانی قبیلوں کو سبائی کہا جاتا تھا۔ لہٰذا، لفظ 'سبئی' حقیقت میں قحطان کے قبیلوں کا انتساب ہے جو یمن میں ساکن تھے۔ سبائی یا سبیئہ کا دوسرا استعمال سیاسی طور پر علی کے ان وفادار جانثار ساتھیوں کے لیے ہوا، جن کا تعلق یمن کے قحطانیوں سے تھا اور انہوں نے جنگ جمل اور صفین میں علی کی جانب سے جنگ لڑی تھی۔ ان میں سر فہرست عمار یاسر (قبیلہ عنس سبائی)، مالک اشتر (قبیلہ نخع سبائی)، حجر بن عدی (قبیلہ کندہ سبائی)، عدی بن حاتم طائی اور ان کے ساتھی سبائی تھے۔ ان کے علاوہ قیس بن سعد عبادہ خزرجی بھی قبائل سبائی کے خاندانوں میں سے تھے، خزیمہ بن ثابت اور حُنیف کے بیٹے سہل اور عثمان سب سبائی یعنی قحطانیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح قبیلہ اوس کے افراد جو ان کے ساتھ تھے سبائی تھے؛ عبد اللہ بدیل، عمرو بن حمق، سلیمان بن صرد اور ان کے قبیلہ کے افراد سب خزاعی سبائی تھے اور یہ سب کے سب علی کے جانثار و وفادار اور بنی امیہ کے سخت مخالف تھے۔ چونکہ علی کے اکثر چاہنے والے شیعہ، قحطانی تھے اور یہ قحطانی 'سبائی' سے منسوب تھے، چنانچہ علی کے مخالفین پہلے ہی دن سے اس نسبت کو ایک قسم کی برائی اور شرمناک نسبت کے عنوان سے پیش کرتے تھے اور لفظ 'سبئی' کو سرزنش و ملامت کے لیے علی کے تمام پیروکاروں اور شیعوں کو 'سبا' سے نسبت دیتے تھے۔ اس طرح اس لفظ کو اپنے اصل معنی سے دور کر کے ایک دوسرے سیاسی معنی میں استعمال کرنے کی روایت شروع ہو گئی تھی۔ یہ لفظ اس زمانہ میں کسی بھی قسم کا مذہبی مفہوم اور دلالت نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس زمانہ میں کوئی اس نام کے کسی مذہبی فرقے کو جانتا بھی نہیں تھا، لیکن دوسری صدی ہجری ہی میں اس لفظ میں ایک تیسری تحریف رونما ہوئی اور یہ لفظ اپنے اصل حقیقی اور پہلے معنی نیز دوسرے سیاسی معنی سے ہٹ کر سیف بن عمر تمیمی کے ذریعہ تحریف ہو کر ایک نئے مذہبی گروہ کے بارے میں استعمال ہوا۔ محقق موصوف کے مطابق، اس تحریف سے سیف کا مقصد اپنے حریف قبیلے ''قحطانی'' کو رسوا کرنا تھا اور اس مقصد میں سیف کو کامیابی بھی ملی۔

فاضل محقق سے قطع نظر عبد اللہ ابن سبا کے کردار کو مستشرقین نے بھی فرضی قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو:

"It is obvious that Ibn e Saba is never in existing person. He was framed by the Safy Tameemi to fabricate the baseless things." (Bernard Lewis)

"The Religion, thrown from to Ibn e Saba is the fabrication of some fake historians"(Fred lender and Julius Wellho)

طٰہ حسین مصری اپنی کتاب "علی و بنوہ" میں لکھتے ہیں؛ "ابن سبا کا کوئی وجود نہیں۔ وہ ایک گھڑی ہوئی شخصیت ہے۔"

اہل سنت میں سے کچھ لوگ عبد اللہ بن سبا کے وجود کا اثبات کرتے ہوئے کئی حوالے دیتے ہیں لیکن ان سب کا ماخذ سیف ہے یا پھر انھوں نے وہ روایات بغیر کسی سلسلہ اسناد کے نقل کی ہیں۔ میں ان اہل علم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ کوئی مشکل کام ہے کہ صرف اور صرف ایک صحیح روایت پیش کر دی جائے جس کے سلسلہ اسناد میں سیف کا نام نہ شامل ہو اور جو یہ بیان کرے؛ (1) عبد اللہ بن سبا، عثمان کے دور میں حاضر ہوا، (2) عبد اللہ بن سبا نے عثمان کے خلاف سازشوں کا آغاز کیا، (3) آخر کیا وجہ ہے کہ جس بات کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ عینی گواہ ہونے چاہئیں تھے، لیکن اس وقت موجود ہزاروں صحابہ و علما میں سے کسی ایک نے بھی عینی گواہ کی حیثیت سے شہادت یا روایت پیش نہیں کی؟

اہل سنت جن روایات کو عبد اللہ بن سبا کے وجود کے اثبات میں پیش کرتے ہیں، ان تمام روایات کو اچھی طرح سے پڑھ جائیں تو آپ کو سامنا درج ذیل نکات سے ہو گا:

ان روایات میں سے بیشتر کا اصل ماخذ سیف ہی ہے۔

(1) جو روایات سیف سے پاک ہیں، ان کے مطابق؛ عبد اللہ ابن سبا، عثمان کے دور کے بہت بعد میں علی ابن ابی طالب کے دور میں ظاہر ہوا۔ جب کہ سیف کی مقبول روایت کے مطابق، عبد اللہ ابن سبا، عثمان

کے ابتدائی دور میں مکمل طور پر ظاہر ہو چکا تھا اور بڑے بڑے اکابر صحابہ گمراہ ہو کر اس کے سبائی گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔

(2) جو روایات سیف سے پاک ہیں، ان کے مطابق؛ جیسے ہی علی کو عبد اللہ ابن سبا کی گمراہی کا علم ہوا، آپ نے اسے (بمع تمام کے تمام اس کے حامیان کے) آگ میں جلوا ڈالا۔ جب کہ سیف کے مطابق؛ عبد اللہ ابن سبا کی سیاسی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ پورے کا پورا اہل مدینہ عثمان کو بچانے سے قاصر رہا۔ پھر جب علی ابن ابی طالب خلیفہ ہوئے، تو انہوں نے بھی اس عبد اللہ ابن سبا اور دیگر سبائین کو کچھ نہ کہا بلکہ اپنی پناہ میں رکھا۔

(3) سیف سے پاک دیگر روایات دعویٰ کرتی ہیں کہ جنگ جمل اور جنگ صفین تک سبائی باقی ہی نہ رہے تھے، بلکہ اس سے بہت قبل علی ابن ابی طالب نے انہیں آگ میں جلوا دیا تھا، لیکن اس کے برعکس سیف کے مطابق، انہی سبائیوں / شیعوں نے بعد میں جنگ جمل اور جنگ صفین رات کے اندھیرے میں شروع کروائی (وہ اس طرح کہ رات کے اندھیرے میں دونوں فوجوں پر حملہ کر دیا، جب کہ دونوں فوجوں کے سردار، یعنی علی ابن ابی طالب، عائشہ، معاویہ ابن سفیان وغیرہ اس سے قبل صلح پر متفق ہو چکے تھے)۔

(4) ابن عساکر نے اسناد والی روایات میں صرف عبد اللہ ابن سبا کے جلائے جانے کا ذکر ہے۔ میں علمائے اہل سنت سے ہی پوچھتا ہوں کہ کیا وہ اس آگ والی روایت کو مانتے ہیں؟ کیونکہ آگ میں جلانا بہت بڑی گمراہی اور بدعت ہے اور شریعت کسی کو یہ سزا دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس صورت میں نہ صرف خلیفہ چہارم علی ابن ابی طالب، بلکہ تمام کے تمام اس وقت مدینے میں موجود صحابہ پر ضلالت و گمراہی کا فتویٰ لگانا ہو گا، کیونکہ انہوں نے یہ بدعت ہوتے ہوئی دیکھی مگر اسے نہ روکا۔

اگر اہل سنت کی پیش کردہ روایات کے مطابق، وہ عبد اللہ بن سبا جو علی کے دور میں ظاہر ہوا، کیا وہ عمر اور عثمان کے دور میں برپا ہونے والی سازشوں میں شامل نہ تھا؟ تو پھر ان دونوں خلفا کے قتل میں کن کی سازشیں کارفرما تھیں؟

یہ موقع قاتلان عثمان پر مباحثے کا نہیں ہے، ورنہ میں سینکڑوں ایسی روایات نقل کر سکتا ہوں جو عبد اللہ بن سبا کی سازشوں کے افسانے کے مقابلے میں سو گنا زیادہ معتبر ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان سینکڑوں روایات کو اہل سنت ردی کی ٹوکری کی نذر کر کے صرف عبد اللہ بن سبا کے افسانوی کردار تک خود کو محدود کر لیتے ہیں؟ اگر واقعی عبد اللہ ابن سبا نے ہزاروں مسلمانوں کو گمراہ کر کے سبائی آلہ کار بنا لیا تھا (جن میں سیف کے مطابق عمار یاسر اور ابو ذر غفاری جیسے جلیل القدر صحابی بھی شامل ہیں)، اور عبد اللہ ابن سبا ہی نے قتل عثمان کیا، اور اس نے جنگ جمل اور جنگ صفین رات کو حملے کر کے شروع کروائی، وغیرہ وغیرہ، تو لازمی طور پر اس کے ہزاروں عینی گواہ ہونے چاہئیں۔ اب خود بتائیے کہ کیا وجوہات ہیں کہ ان سینکڑوں عینی گواہان کی گواہی کو تو اس بنیاد پر ٹھکرا دیا جائے کہ ان کے بیان کرنے سے صحابہ کے اندرونی اختلافات کا ذکر سامنے آتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں سیف کے دیومالائی قصوں کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے اور 1200 سال اس کا کھل کر پروپیگنڈہ کیا جائے، جس کے جھوٹے ہونے میں ذرا برابر بھی شک نہیں؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "عبد اللہ بن سبا" کا فرضی کردار اور "سبائی سازش" کا اہتمام صرف اس لیے کیا گیا تا کہ صحابہ کے ان آپسی اختلافات کی پردہ پوشی کی جا سکے جو اس حد تک منافرت کی غلاظت میں لتھڑے ہوئے تھے کہ اقتدار کی رسہ کشی اور حب جاہ کے لیے وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی گردن اڑانے کا کوئی موقع نہیں گنواتے تھے۔ بعد کے مسلمانوں کی نسوں میں شخصیت پرستی کا زہر اس طرح داخل ہوا کہ انھوں نے یا تو اپنے اکابرین کی فاش غلطیوں، مکاریوں اور سازشوں کو "خطائے اجتہادی" کا نام دیا یا ان پر اغیار کی "سازش" کا دبیز غلاف ڈال دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ عبد اللہ بن سبا مر گیا، وہ اب بھی مسلمانوں کے ذہن میں زندہ ہے، کبھی امریکہ کی صورت تو کبھی بھارت کی شکل میں اور کبھی یہود کے روپ میں۔ لہٰذا، امت مسلمہ کی تمام خامیوں اور برائیوں کے ذمہ دار یہی جدید ابن سبا یعنی امریکہ، بھارت اور یہود ہیں، چونکہ مسلمانوں کی تاریخ میں "خود احتسابی" کی روایت سرے سے ناپید ہے۔

یزید بن معاویہ

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حسین 20 سال کی عمر سے معاویہ کی بیعت میں داخل تھے اور حسن کی وفات کے بعد بھی حسین پر معاویہ کی نوازشات کا سلسلہ برقرار رہا۔ ابن ابی الحدید، شارح نہج البلاغہ بھی کہتے ہیں کہ "حسین کو امیر المومنین معاویہ مقررہ رقم وظیفہ کے علاوہ بڑے بڑے عطیات دیتے اور بے تحاشا دیتے، حوائج و ضروریات ان کی پوری کرتے، مقروض ہونے پر قرض بھی ادا کر دیتے جیسے ایک لاکھ روپیہ ادا کر کے حسین کا قرضہ عین ابی نیزر کا ادا کرایا تھا۔" (الاصابہ فی تمیز الصحابہ، جلد 4، صفحہ 199)

آگے بڑھنے سے قبل یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم معاویہ کے فرزند اور واقعہ کربلا کے سب سے بڑے "ویلن" یعنی یزید بن معاویہ کا ایک مختصر تعارف پیش کر دیں۔

حسین اور یزید کے قریبی رشتے

یزید سے حسین کے رشتے حسب ذیل تھے:

(1) ایک رشتے سے حسین، یزید کی پھپیری بہن کے شوہر ہونے سے ان کے بہنوئی بھی تھے اور معاویہ کے بھاجن داماد۔ یہ بھانجی معاویہ کی سیدہ آمنہ بن سیدہ میمونہ بنت ابو سفیان، حسین کی زوجیت میں تھیں۔ ان کے فرزند علی اکبر انھی کے بطن سے تھے۔

(2) دوسرے رشتے سے یزید، حسین کے بھتیج داماد بھی تھے۔ حسین کے تایازاد بھائی اور بہنوئی یعنی زینب کے شوہر عبد اللہ بن جعفر طیار کی دختر سیدہ ام محمد، یزید کی زوجہ تھیں۔

(3) ایک تیسرا رشتہ یہ بھی تھا کہ معاویہ کی زوجہ اور یزید کی والدہ سیدہ میسون، حسین کی زوجہ الرباب جو سکینہ کی والدہ تھیں، بنو کلب کے دو سگے بھائیوں زہیر و علیم کی اولاد میں ہونے سے چچیری بہنیں تھیں، اس لیے حسین خالو تھے اور یزید کے ساڑھو تھے۔

جہاد قسطنطنیہ

بیعت خلافت کے علاوہ یزید کے لشکر میں شامل ہو کر حسین نے جہاد قسطنطنیہ میں شرکت بھی کی تھی۔ شیعہ مورخ امیر علی نے اپنی کتاب "ہسٹری آف سیر ینز" میں حسین کے جہاد قسطنطنیہ کا ذکر تو کیا ہے لیکن لشکر یزید کا نام تک نہیں لیا، جب کہ غیر مسلم مورخین خصوصاً ایڈورڈ گبن نے اپنی مشہور کتاب "رومتہ الکبریٰ عروج و زوال" میں قسطنطنیہ کے اس معرکے کا ذکر کرتے ہوئے یزید کی موجودگی، بشارت مغفرت کی حدیث، ایوب انصاری کی وفات وغیرہ کا تذکرہ صراحت سے کیا ہے۔ قسطنطنیہ پر پہلا جہاد یہی تھا جو 49 ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ اس جہاد کے مجاہدین کی بشارت مغفرت کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔ علامہ ابن کثیر کے مطابق:

"اور اس 49 ہجری میں یزید بن معاویہ نے رومی شہروں پر جہاد کیا، حتیٰ کہ قسطنطنیہ پہنچے، ان کے ساتھ اکابر صحابہ کی جماعت تھی، اس میں ابن عمر و ابن عباس و ابن زبیر و ابو ایوب انصاری تھے۔ صحیح بخاری کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے، اس کے لیے مغفرت ہے۔ یہی وہ لشکر تھا جس نے سب سے اول جہاد (قسطنطنیہ) پر کیا تھا۔" (البدائیہ والنہائیہ، جلد 8، صفحہ 151)

ابن کثیر نے جس حدیث کا تذکرہ کیا ہے، وہ صحیح بخاری میں، الجہاد والسیر، باب ما قیل فی قتال الروم، رقم 2924 کے تحت مندرج ہے۔ بخاری کی ہی ایک اور حدیث ہے:

"محمد بن ربیع نے بیان کیا ہے کہ میں نے یہ حدیث ایک ایسی جگہ میں بیان کی جس میں رسول اللہ کے مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری بھی موجود تھے۔ یہ روم کے اس جہاد کا ذکر ہے جس میں آپ کی موت واقع ہوئی تھی۔ فوج کے سردار یزید بن معاویہ تھے۔" (بخاری، 1189)

حافظ ابن حجر (متوفی 852) نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؛ "یزید رحمہ اللہ اس پہلے لشکر کے امیر تھے، اس پر سب کا اتفاق ہے۔" (فتح الباری، 6/ 103)

طوالت سے بچنے کی خاطر میں ان تمام حوالوں کو نظر انداز کر رہا ہوں جو مہلب بن احمد، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن حجر اور علامہ قسطلانی وغیرہ سے منسوب ہیں۔ کچھ مخالفین بطور خاص شیعہ حضرات کا دعویٰ ہے کہ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ یزید نے نہیں بلکہ معاویہ نے کیا تھا، اور دلیل کے طور پر وہ حافظ ابن کثیر کا یہ قول نقل کرتے ہیں: "اور 32 ہجری میں سیدنا معاویہ نے بلاد روم پر چڑھائی کی، یہاں تک کہ وہ خلیج قسطنطنیہ تک پہنچ گئے۔" (البدایہ والنہایہ، 7/159)

سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہاں دعویٰ قسطنطنیہ پر حملہ کا ہے اور دلیل بلاد روم کی دی جارہی ہے، چنانچہ ذکر عام سے خاص کا ثبوت کیوں کر مہیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایک بہت لمبی بحث ہے جس پر اپنے قارئین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ دونوں فریقین محض اس لیے اس بحث میں پڑے ہیں کیوں کہ ان میں سے ایک یزید کو جنتی ثابت کرنا چاہتا ہے، جب کہ دوسرا اسے جنت سے نکالنے پر بضد ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ یزید جنتی تھا یا نہیں، بلکہ ہمارا مقصد صرف اور صرف اتنا جاننا ہے کہ یزید، حسین کے مقابلے میں منصب خلافت کے لیے کتنا زیادہ حقدار تھا۔

بہر حال، جہاد قسطنطنیہ میں سپہ سالار لشکر یزید نے کچھ اس طرح شجاعت کا ثبوت دیا، جس کی بنا پر امت مسلمہ نے اسے "فتی العرب" (عرب کا سورما) کا خطاب دیا۔ یزید ہی عرب کا وہ پہلا شخص تھا، جسے یہ خطاب حاصل ہوا، جس کا اعتراف پروفیسر حتی نے بھی اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربس" میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ معاویہ کے دور خلافت میں تین مرتبہ یزید امیر حج کے منصب پر بھی فائز رہا۔ ان تین برسوں کے درمیان حسین نے بھی یزید کی امارت میں حج کے مناسک ادا کیے اور اس کی امامت میں نماز پڑھی۔

یزید کا کردار

جہاں تک یزید کے کردار کا سوال ہے تو اس کے ساتھ شیعوں اور سنیوں؛ دونوں نے بڑی ناانصافی کی ہے۔ انھوں نے یزید کو ایک بدکردار، شرابی، نماز چھوڑنے والا اور کتاب اللہ کی خلاف ورزی کرنے والا بتایا ہے۔ اس کی رد میں

کسی اور کا نہیں، بلکہ خود حسین کے بھائی محمد بن حنفیہ کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں جسے میں یہاں اختصار کے ساتھ درج کرنے کا گنہگار ہوں:

"جب اہل مدینہ یزید کے پاس آئے تو عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی محمد بن حنفیہ کے پاس آئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ یزید کی بیعت توڑ دیں لیکن محمد بن حنفیہ نے ان کی اس بات سے انکار کر دیا، تو عبداللہ بن مطیع نے کہا: یزید شراب پیتا ہے، نماز چھوڑتا ہے، کتاب اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو محمد بن حنفیہ نے کہا کہ میں نے تو اس کے اندر ایسا کچھ نہیں دیکھا جیسا تم کہہ رہے ہو، جب کہ میں اس کے پاس جا چکا ہوں اور اس کے ساتھ قیام کر چکا ہوں، اس دوران میں نے تو اسے نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، علم دین کا طالب اور سنت کا ہمیشہ پاسدار پایا۔" (البدایہ و النہایہ؛8 / 233، تاریخ الاسلام للذہبی، 5 / 274)

یزید کے کردار پر امام ابو بکر ابن العربی (متوفی 543) کی بھی رائے سن لیں:

"اگر کہا جائے کہ یزید شرابی تھا تو ہم کہتے ہیں کہ بغیر دو گواہ کے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی، تو کسی نے اس بات کی گواہی دی ہے؟ بلکہ عادل لوگوں نے تو یزید کے عدل کی گواہی دی ہے۔" (العواصم من القواصم لابی بکر ابن العربی، صفحہ 228)

غرضیکہ یزید کے کردار میں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے اس کی بیعت خلافت ناجائز ٹھہرتی۔ ایک عیسائی مورخ یزید کی سیرت کے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہے؛

"وہ (یعنی یزید) حد درجہ حلیم و کریم، سنجیدہ و متین، غرور و خود بینی سے مبرا، اپنی زیر دست رعایا کا محبوب، تزک و احتشام شاہی سے متنفر تھا۔ عام شہریوں کی طرح سادہ معاشرت سے زندگی بسر کرنے والا اور مہذب تھا۔ " (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، صفحہ 1163)

اب ایک نظر حجتہ الاسلام امام غزالی کی رائے پر بھی ڈال لیتے ہیں:

"اور یزید صحیح الاسلام تھا اور یہ صحیح نہیں کہ اس نے حسین کو قتل کرایا یا اس کا حکم دیا یا اس پر راضی ہوا۔ پس جب کہ یہ قتل اس سے پایہ ثبوت کو نہیں پہونچتا تو پھر اس کے ساتھ ایسی بد گمانی رکھنا حرام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بد گمانی سے بہت بچتے رہو، اس لیے کہ بعض بد گمانیاں سخت گناہ ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مسلم کا مال، اس کی جان، اس کی آبرو ریزی اور اس کے ساتھ بد گمانی کرنے کو حرام ٹھہرایا ہے۔ جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ یزید نے قتل حسین کا حکم دیا، اس پر رضامندی کا اظہار کیا، تو جاننا چاہیے کہ وہ شخص پلے درجہ کا احمق ہے ...پس یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی صحیح حقیقت کا ہرگز پتہ نہیں چل سکتا اور جب حقیقت تعصب پردوں میں روپوش ہے تو پھر مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن رکھنا واجب ہے، جہاں حسن ظن کے قرائن ممکن ہوں۔ رہا ان پر (یزید پر) رحمتہ اللہ علیہ کہنا، سو یہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے اور ہم ان پر رحمت کی دعا اپنی نمازوں میں تمام مسلمین و مومنین کے شمول میں مانگا کرتے ہیں۔" (دفیات الاعیان لابن خلکان، جلد اول، صفحہ 465؛ البدایہ والنہایہ، جلد 12، صفحہ 173)

یزید کی ولیعہدی

اب وہ زمانہ آگیا جب یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ در پیش ہوا۔ پیغمبر اسلام کے صحابی مغیرہ بن شعبہ نے یہ تحریک پیش کی کہ معاویہ اپنی زندگی میں ہی یزید کی ولیعہدی کا بندوبست کر دیں۔ چونکہ اب تک خلافت کو باپ سے بیٹے کی طرف منتقل کرنے کا رواج نہ تھا، اس لیے معاویہ نے پس و پیش ظاہر کی۔ چنانچہ معاویہ نے استصواب رائے کے لیے ایک اجتماع کا انعقاد کیا جس میں تمام ولایتوں کے نمائندے موجود تھے، عراقی بھی موجود تھے۔ اگرچہ اس اجتماع میں بعض نے یزید کی ولیعہدی کی مخالفت میں بھی تقریریں کیں لیکن بھاری اکثریت کا فیصلہ یزید کی ولیعہدی کے حق میں ہوا۔ کتب تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس فیصلے کے باوجود معاویہ مطمئن نہیں تھے، کیوں کہ انھیں پتہ چلا کہ بعض قریش اس سے متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ مورخین کے مطابق معاویہ نے حج و زیارت کے بہانے سفر کیا، جہاں سب لوگوں نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ معترضین کے ایک حلقہ کا یہ کہنا ہے کہ امت نے یہ رائے جبر کے تحت دی، مثلاً طبری کی روایت میں کہا گیا ہے کہ جن پانچ قریشی حضرات نے اختلاف کیا تھا، معاویہ نے ان سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ جب وہ متفق نہ ہوئے تو فرمایا کہ مجمع عام میں اگر تم میں سے کسی نے مخالفت کی تو تمھاری خیر نہیں، سر اڑا دیا جائے گا۔ لہٰذا مجمع عام میں جب یہ لوگ آکر بیٹھے تو ایک ایک فوجی ان کے پیچھے تلوار لے کر کھڑا کر دیا گیا۔ لہٰذا، ان قریشی حضرات میں سے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور سب دم بخود بیٹھے رہے۔ (طبری، جلد اول، صفحہ 200)

یہ روایت اس لیے غلط لگتی ہے، چونکہ اول تو یہ واقعہ بقول طبری 56ھ کا ہے، اور طبری نے ان پانچ لوگوں میں عبداللہ بن ابی بکر کا نام بھی لیا ہے، جو اس وقت زندہ ہی نہ تھے، بلکہ تین سال قبل یعنی 53ھ میں انتقال کر گئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اگر طبری کے یہ پانچ اشخاص میں سے بقیہ چار اشخاص (جو اس وقت زندہ تھے) اگر اپنی جان کھیل کر مخالفت کر بیٹھتے اور معاویہ انھیں قتل کر دیتے تو کیا اس سے رائے عامہ استوار ہو جاتی؟ بلکہ یہ تو اپنے پاؤں پر کلھاڑی مارنے کے مترادف ہوتا، اور معاملہ اتنا بگڑ جاتا کہ یزید کی ولیعہدی کیا، خود معاویہ کی خلافت خطرے میں پڑ جاتی۔ میرے خیال میں معاویہ اتنے احمق تو نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے اس حماقت کے بل بوتے پر 20 سال منصب خلافت پر قائم رہے۔ پھر تیسری اور آخری بات یہ کہ جس فیصلہ پر پوری امت متفق ہو، اس پر صرف پانچ لوگوں کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے، خواہ وہ فضیلت کے کسی بھی مقام پر فائز ہو؟ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس پر اچھی بحث کی ہے جسے میں طوالت کے سبب چھوڑ رہا ہوں (دیکھیے، مقدمہ ابن خلدون، صفحہ 175-176)

قصہ مختصر، عالم اسلامی کے ہر علاقہ میں لوگوں نے بغیر کسی اختلاف کے یزید کی بیعت کی اور ہر جگہ کے وفود بیعت کے لیے یزید کے پاس حاضر ہوئے۔

معاویہ کی وفات اور یزید کے عہد کا آغاز

رجب 60ھ میں جب امیر المومنین معاویہ کی وفات کی خبر مکہ پہنچی تو حسین کے چچا عبداللہ بن عباس وہاں موجود تھے:

"عامر بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم مکہ میں تھے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر دینے والا ہمارے پاس سے گذرا تو ہم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس پہونچے، وہ بھی مکہ میں ہی تھے، وہ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور دستر خوان لگایا جا چکا تھا لیکن ابھی کھانا نہیں آیا تھا، تو ہم نے ان سے کہا: اے ابوالعباس! ایک قاصد امیر معاویہ کی وفات کی خبر لایا ہے، یہ سن کر عبداللہ بن عباس کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر فرمایا: اے اللہ! معاویہ پر اپنی رحمت وسیع فرما، یقیناً آپ ان لوگوں کے مثل تو نہ تھے جو آپ سے پہلے گذر چکے، لیکن آپ کے بعد بھی آپ جیسا کوئی دیکھنے کو نہ ملے گا اور آپ کے صاحبزادے یزید بن معاویہ رحمہ اللہ آپ کے خاندان کے نیک و

صالح ترین شخص ہیں۔ اس لیے اے لوگو! اپنی اپنی جگہوں پر رہو اور ان کی مکمل اطاعت کر کے ان سے بیعت کر لو، (اس کے بعد غلام سے کہا) اے غلام کھانا لے کر آؤ۔ عامر بن مسعود کہتے ہیں کہ ہم اس حالت میں تھے کہ خالد بن العاص المخزومی رضی اللہ عنہ کا قاصد آیا، وہ اس وقت مکہ کے عامل تھے، اس نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لیے بلایا۔ عبد اللہ بن عباس نے کہا؛ اس سے کہہ دو کہ پہلے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا کام ختم کر لے اور شام ہو گی تو ہم اس کے پاس آجائیں گے۔ یہ سن کر قاصد لوٹ گیا، اس کے بعد عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے پاس حاضر ہونا لازمی ہے۔ پھر آپ گئے اور (یزید کی) بیعت کر لی۔ " (انساب الاشراف للبلاذری، 290/5)

حسین کی باغیانہ سرگرمیاں اور خیر خواہوں کے مشورے

مکہ میں حسین چار ماہ سے زیادہ عرصہ تک مقیم رہے اور اس تمام مدت میں عراقیوں کے خطوط اور ان کے وفود آتے جاتے رہے۔ خروج کی تیاریاں ہوتی رہیں لیکن حکومت کی جانب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور نہ ان کے پاس وفود کے آنے جانے پر کوئی پابندی عائد کی گئی لیکن ظاہر ہے کب تک؟ بالآخر یزید نے عبد اللہ بن عباس کو خط لکھا؛

"اور یزید ابن معاویہ نے ابن عباس کو مکہ خط لکھا جس میں انھوں نے مطلع کیا کہ حسین (مدینہ سے نکل کر) مکہ کو چلے گئے ہیں۔ اہل مشرق (یعنی عراقیوں) میں سے چند آدمی ان کے پاس آئے ہیں اور انھیں حصول خلافت کے لیے آمادہ کیا ہے، آپ کو حالات کا علم اور تجربہ (سابقہ واقعات کا) ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو انھوں نے (حسین نے) قرابت کے مضبوط رشتے کو قطع کر دیا ہے۔ آپ اہل بیت کے بزرگ ہیں اور حسین کے پسندیدہ شخص ہیں، اس لیے آپ انھیں تفرقہ ڈالنے سے روکیں۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 164)

دیگر مورخین کے علاوہ "ناسخ التواریخ" کے شیعہ مصنف میرزا محمد تقی سپہر کاشانی نے بھی تقریباً اسی عبارت کو برقرار رکھا ہے جو ابن کثیر وغیرہ نے لکھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو، جلد 2، کتاب دوم، صفحہ 171) عبد اللہ بن عباس نے یزید کے اس خط کا جو جواب دیا، وہ بھی اس میں رقم ہے:

"تم نے جو چاہا ہے، اس کو پورا کرنے کے لیے میں اس سے گفتگو کروں گا اور انھیں نصیحت کروں گا جس سے اختلاف رفع ہو جائے اور فتنہ وفساد کی آگ بجھ جائے اور امت کے لوگوں کا خون نہ بہنے پائے۔" (ایضاً، صفحہ 172)

درج بالا خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ حسین کا اقدام محض سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے تھا۔ ابو سعید خدری کا یہ قول بھی ملاحظہ فرمائیں: "حسین نے مجھ پر خروج کرنے کے لیے زور دیا تو میں نے کہا؛ اپنے دل میں خدا سے ڈرو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو اور اپنے امام (یزید) کے خلاف خروج نہ کرو۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 163)

ابو واقد اللیثی بتاتے ہیں؛ "میں نے انھیں اللہ کا واسطہ دلایا کہ خروج نہ کریں، کیوں کہ جو بے وجہ خروج کرتا ہے، وہ اپنی جان کھو دیتا ہے۔" (ایضاً، صفحہ 163)

جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں؛ "میں نے حسین سے گفتگو کی اور کہا کہ خدا سے ڈرو اور آدمیوں کو آدمیوں سے نہ مرواؤ۔" (ایضاً)

مورخین نے اسی طرح کافی لوگوں کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے حسین کو خروج سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ان کی ہٹ دھرمی اور ناعاقبت اندیشی غالب رہی۔ عبد اللہ بن عباس جو یزید سے بیعت کر چکے تھے، ان کے بارے میں ایک متضاد رائے ایک حلقہ اپنے طور پر بحوالہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انھوں نے حسین کو وقت رخصت مشورہ دیا تھا کہ:

"اگر تم کو اہل عراق بلاتے ہیں تو انھیں لکھ بھیجو کہ اپنے دشمن سے پیچھا چھڑا لیں، اس کے بعد ان کے پاس جاؤ۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 217)

گویا ابن عباس نے اس خلیفہ کے خلاف حسین کو بھڑکانے کی کوشش کی جس کی وہ خود بیعت کر چکے تھے۔ راوی آگے کہتا ہے:

"اگر تم کو یہاں سے نکل جانا ہی منظور ہے تو یمن کی طرف چلے جاؤ، وہاں قلعے میں گھاٹیاں ہیں، وہ ایک عریض و طویل ملک ہے۔ تمھارے والد کے طرفدار وہاں موجود ہیں۔ تم سب لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے لوگوں سے خط و کتابت کرو، اپنے داعیوں اور قاصدوں کو بھیجو۔ اس طریقہ سے مجھے امید ہے کہ جو بات تم کو محبوب ہے اور تم چاہتے ہو (یعنی حکومت و خلافت) وہ تمھیں امن وعافیت کے ساتھ حاصل ہو جائے گی۔" (ایضاً)

لیکن دلچسپ بات یہ کہ اسی طبری کے اسی جلد اور اسی صفحہ پر اس واقعہ کے سب سے قدیم راوی ابو مخنف کی روایت اس کے متضاد ہے، اس روایت میں ابن عباس اپنے بھتیجے حسین کو کہتے ہیں:

"قسم ہے وحدہُ لاشریک کی کہ اگر میں سمجھتا کہ تمھارے بال اور گردن پکڑ کر روک لوں یعنی دست و گریباں ہو جاؤں، یہاں تک کہ لوگ میرا تمھارا تماشہ دیکھنے کو جمع ہو جائیں اور تم میرا کہنا مان لوگے تو میں ایسا ہی کر گذرتا۔" (ایضاً)

حتیٰ کہ حسین نے اپنے چچا سے کہا؛ "آپ بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔ گویا حسین کہنا چاہ رہے تھے کہ آپ سٹھیا گئے ہیں۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 164)۔ مجبور اور بے بس چچا نے بھتیجے کی ہٹ دھرمی کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیے اور اس سے کچھ یوں ملتجی ہوا، "پس اگر تم جاتے ہی ہو تو اپنی اولاد اور خواتین کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بخدا مجھے خوف ہے کہ کہیں 11 تم بھی اسی طرح قتل نہ ہو جاؤ جس طرح عثمان، کہ ان کے بیوی بچے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 217؛ البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 160؛ مقاتل الطالبین، صفحہ 110)

حسین نے اپنے شفیق اور بزرگ چچا کی یہ بات بھی نہ مانی، حالاں کہ انھیں یہ بات اس وقت یاد آئی جب کربلا میں انھیں اپنی خواتین کے گریہ کی آوازیں آئیں، تب وہ پکار اٹھے تھے؛ "خدا کی قسم، ابن عباس نے کیا صحیح بات کہی تھی۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 242؛ البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 179)

بہرحال، یہ واضح ہے کہ حسین کے اس اقدام کی تائید میں مکہ و مدینہ یا حجاز کا ایک شخص بھی سوائے ان کے چند نوجوان عزیزوں کے، ان کے ساتھ کوئی نہ ہوا۔ ان کے اپنے اہل خانہ میں علی کے پندرہ بیٹوں؛ جو اس وقت حیات تھے، صرف چار اپنے بھائی کے ساتھ گئے، بقیہ گیارہ بھائیوں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک بھائی محمد بن حنفیہ کا ذکر کیا جا چکا ہے، جن پر حسین نے اس مہم میں ساتھ دینے پر کافی زور ڈالا، حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ اگر خود ساتھ نہیں دیتے تو اپنی اولاد کو ہی اجازت دے دیں کہ وہ میرے ساتھ چلیں لیکن محمد بن حنفیہ نے صاف انکار کر دیا۔ حسین کے ایک دوسرے بھائی عمر تھے جو حسین کے اس اقدام کے خلاف تھے۔ شیعہ مورخ اپنی تالیف "عمدۃ الطالب" میں لکھتا ہے:

"اور عمر نے اپنے بھائی حسین سے اختلاف کیا اور ان کے ساتھ کوفہ کو خروج نہ کیا، حالاں کہ انھوں نے ان کو اپنے ساتھ خروج کرنے کی دعوت بھی دی، مگر یہ ان کے ساتھ نہ گئے۔ کہتے ہیں کہ جب ان کو اپنے بھائی حسین کے قتل ہو جانے کی خبر ملی تو وہ زرد لباس پہن کر نکلے اور اپنے مکان کے صحن میں آکر بیٹھے اور کہا کہ میں ایک عقلمند اور محتاط جوان ہوں اور اگر میں بھی ان کے (حسین کے) ساتھ نکلتا تو لڑائی میں شریک ہوتا اور مارا جاتا۔" (صفحہ 357)

واضح رہے کہ حسین کے اس اقدام کے وقت حجاز و عراق اور دیگر مملکت اسلامیہ میں صحابیِ رسول کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جنھوں نے برسوں پیغمبر اسلامی کی معیت میں زندگی گذاری، ان کے ساتھ جہاد و غزوات میں شریک ہوئے لیکن ان میں سے ایک صحابی نے بھی حسین کا کسی طرح کا ساتھ نہ دیا اور نہ ہی یزید کی خلافت کو ناجائز قرار دیا۔

ظاہر ہے کہ اس کی وجہ اقوال رسول ہی رہے ہوں گے جو وہ انھیں ازبر تھے:

"عرفجہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا؛ جب آپ لوگ ایک شخص (کی حکومت) پر متفق ہوں اور کوئی آکر آپ کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرے یا آپ کی اجتماعیت میں تفرقہ پیدا کرے تو اسے قتل کر دیجیے۔"

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: اگر (بیک وقت) دو خلفا کی بیعت کی جائے تو بعد والے کو قتل کر دو۔"

"ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: آپ پر ایسے امرا مسلط ہوں گے جن کی برائی کو آپ لوگ پہچان بھی لیں گے اور بعض اعمال کی برائی کو آپ سمجھ نہیں پائیں گے۔ جس نے ان کے اعمال بد کو پہچان لیا، وہ بری الذمہ ہو گیا۔ جو نہ پہچان سکا، وہ بھی محفوظ رہا لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور اس نے تابعداری کی (وہ دنیا و آخرت میں ناکام ہوا)۔ صحابہ نے عرض کیا، کیا ہم ایسے حکمرانوں سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا، "نہیں، جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔"

(صحیح مسلم، کتاب الامارہ، حدیث نمبر: 1852-1854)

تاریخی روایتوں کی مفلسی

واقعہ کربلا کا پس منظر تیار ہو چکا تھا، یزید کی (گنتی کے چار پانچ لوگوں کو چھوڑ کر) تمام امت مسلمہ نے بیعت کرلی تھی، معاویہ کا وفات ہوچکا تھا اور یزید خلافت کے منصب پر فائز ہو چکا تھا، دوسری جانب حسین کی باغیانہ سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور وہ اپنی ہٹ دھرمی پر اس طرح قائم تھے کہ اپنے خیر خواہوں، امت کے مقتدر صحابہ، حتیٰ کہ اپنے چچا عبد اللہ بن عباس اور اپنے گیارہ بھائیوں کے سمجھانے کے باوجود خروج پر آمادہ تھے۔

میں نے آغاز میں ہی عرض کر دیا تھا کہ واقعہ کربلا میں بڑی پیچید گیاں ہیں، اور یہ پیچید گیاں تاریخ کے تضادات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور یہ تضادات مسلمانوں کے مختلف مکاتیب فکر کے زاویہ ہائے نظر کے سبب ہیں۔ واقعہ کربلا کے موضوع پر بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں اور اس واقعہ سے جڑے تمام مختلف ہائے نظر کے فریقین نے اپنے اپنے طور پر داد سخن دینے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی پوری تاریخ جھوٹی اور گڑھی ہوئی ہے لیکن بطور خاص اس واقعہ سے متعلق ایسا جھوٹ گڑھا گیا ہے جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں ملنی ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے۔

ایسے میں ہمارے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم اس واقعہ کے سب سے اول و قدیم راوی ابو مخنف کے "مقتل الحسین" کو اپنا ہدف بنائیں، چونکہ بعد کے لوگوں یعنی ابن سعد، طبری، واقدی وغیرہ تمام مورخین نے اسی اکلوتے ماخذ سے اکتساب کرتے ہوئے اپنے تخیل کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم ابو مخنف کو اپنی تحقیق کی اساس ضرور قرار دے رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی افسانہ طرازی اور تخیل سازی پر تکیہ کرلیں گے بلکہ ایک دیانت دار تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اس کا تنقیدی محاسبہ بھی ساتھ ساتھ

کرتے رہیں گے۔ لیکن آگے بڑھنے سے قبل یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس راوی یعنی ابو مخنف کا ایک مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔

ابو مخنف

اس مورخ کا نام لوط، کنیت ابو مخنف تھا جو کوفہ میں ہی پیدا ہوا اور وہیں رہائش پذیر بھی رہا۔ اس کا سلسلہ نسب یوں ہے؛ ابو مخنف لوط بن یحییٰ بن سعید بن مخنف بن سلیم بن الحارث بن عوف بن ثعلبہ بن غامد کوفہ کے ممتاز بیت الازد میں سے تھا۔ اس کے جد اعلیٰ مخنف بن سلیم تھے جن کے نام سے اس کی کنیت ہے۔ یہ علی کے ایک ایسے معتبر و معتمد ساتھیوں میں سے تھے کہ انھیں اصبہان و ہمدان کا انھوں نے والی مقرر کیا تھا۔ پھر علی کی طلبی پر جنگ جمل و صفین دونوں خونریز لڑائیوں میں اپنے قبیلہ ازد کے علاوہ چار اور قبیلوں کے تیغ زنوں کو اپنی کمان میں لڑوایا تھا۔ ان کے متعدد عزیز جنگ جمل میں مارے گئے اور یہ خود بھی جنگ صفین میں مقتول ہو گئے۔

بعض لوگوں نے ابو مخنف کے باپ یحییٰ کو بھی علی کے ساتھیوں میں شمار کیا ہے۔ المختصر، ابو مخنف کوفہ کے ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جس کے بزرگ اور سرپرست نہ صرف شیعہ مسلک کے تھے بلکہ جنگ جمل اور صفین میں خلیفہ سوم عثمان کے خون کے قصاص کے طالبین کے خلاف علی کے ساتھ نبرد آزمائی میں حصہ لے چکے تھے۔ اہل سنت اسی لیے اسے "سبائی" کہہ کر اسے کذاب قرار دیتے ہیں، ان کے مطابق اس پر کوفہ کے دوسرے لوگوں کی طرح جارحانہ شیعیت اور سبائیت کا غلبہ تھا لیکن یہ بات محض مسلکی تعصب پر مبنی ہے۔ اسی کوفہ اور اسی بنو الازد میں عبداللہ بن عائذ بھی تھے جو معاویہ کے ساتھ تھے، سفیان بن اعوف ازدی بھی تھے جنھوں نے خلافت معاویہ میں رومیوں کے خلاف بحری مہمات میں خدمات انجام دیں۔

ابو مخنف کی سن ولادت کا پتہ تو تاریخ میں نہیں ملتا، البتہ اکثر مورخین کے مطابق وہ قبل 170 ہجری فوت ہوا، بعض نے 157 ہجری بتایا ہے۔ اسے جہاں ایک طرف دار قطنی، ابن عساکر، سیوطی، امام بن عدی، ابن تیمیہ، ذہبی، ابو حاتم، امام یحییٰ بن معین، علامہ مزۃ وغیرہ نے جھوٹا، ناقابل اعتماد، رافضی، جھلا بھنا شیعہ وغیرہ جیسے القابات سے نوازا ہے، وہیں دوسری طرف سید علی اکبر برقعی قمی، ابو مخنف کو رئیس مورخین کوفہ بتا کر کہتے ہیں، "ابو مخنف کو

تاریخ نگاری و روایات اور فتوح عراق میں دوسروں پر برتری ہے۔ مدائنی کو تاریخ خراسان و ہند و فارس میں دوسروں پر برتری ہے اور قداوی تاریخ حجاز و سیرت میں دوسروں پر مقدم ہے۔ اور یہ تینوں فتوح الشام میں مساوی ہیں اور معلومات میں بھی برابر۔"(شیعہ پاپدیدارندگان فنون اسلام، صفحہ 129)

ابو مخنف کی تالیفات

ابن الندیم نے ابو مخنف کی 47 تالیفات گنوائے ہیں، جن میں صرف "مقتل" نام سے 9 کتابیں یا کتابچے شامل ہیں یعنی مقتل عثمان، مقتل علی، مقتل الحسن السبط، مقتل الحسین، مقتل محمد بن ابی بکر ولاشتر و محمد بن حنفیہ، مقتل حجر بن عدی، مقتل عبداللہ بن الزبیر، مقتل ضحاک بن قیس، مقتل سعید بن العاص۔ مقتل کے نام سے کتابچے لکھنے کا آغاز ابو مخنف نے ہی کیا۔ اس کی دیگر تالیفات میں "الجمل و کتاب صفین"، "کتاب وفات معاویہ ولایتہ ابنہ یزید"، "کتاب المختار بن ابی عبیدہ"، "کتاب سلیمان بن صرد" وغیرہ ہیں، جن میں اب کوئی بھی دستیاب نہیں۔

ابو مخنف کا زمانہ 1200 برس کا اس قدر قدیم زمانہ ہے کہ اس کی کسی تصنیف کا کوئی قلمی نسخہ نہیں پایا جاتا، البتہ کوئی ڈیڑھ سو برس بعد ابن جریر طبری (متوفی 310ھ) نے اس کے تاریخی کتابچوں کی روایتوں اور "مقتل الحسین" کا کُل مواد اپنی تاریخ میں درج کر دیا۔ شاید اسی وجہ سے طبری کو بھی شیعہ الخیال کہا جاتا ہے، حالاں کہ وہ شافعی تھے۔ اگرچہ دوسروں نے بھی مقتل الحسین کے نام سے کتابچے لکھے لیکن انھیں ابو مخنف کے مقتل الحسین کے مقابلے میں اس لیے شہرت نہ مل سکی چونکہ اسے واقعہ کربلا کے پہلے قدیم راوی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مقتل الحسین کا ناقدانہ جائزہ

ابو مخنف کو واقعہ کربلا میں وہی حیثیت حاصل ہے، جس طرح سیرت رسول میں ابن اسحاق کو؛ اور جس طرح بعد کا کوئی سیرت نگار ابن اسحاق کو نظر انداز کرکے آگے ایک قدم نہیں رکھ سکتا، اسی طرح واقعہ کربلا کا تاریخی جائزہ لینے والا کوئی دیانت دار شخص ابو مخنف کے "مقتل الحسین" سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ دوسرے اسلامی مورخین کی طرح ابو مخنف نے بھی اپنے کتابچے میں تعصب، غلو اور جھوٹ کا کوہ گراں کھڑا کرنے کی جابجا

کوشش کی ہے، جس کا محاسبہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہے گا۔ واقعہ کربلا کا تسلسل برقرار رکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ابو مخنف کی متذکرہ کتاب کے کچھ اہم پہلوؤں کا ناقدانہ جائزہ مختصراً لے لیا جائے، مثلاً:

- پہلے کہا جا چکا ہے کہ عقیل بن ابی طالب، علی کے بڑے بھائی صفین میں معاویہ کے ساتھ ہونے کے سبب اہل تشیع کی نظر میں مبغوض تھے اور انھیں جاہلیت کا پیروکار کہا جاتا تھا، طبری نے بھی کتاب الاحتجاج میں ان کے حوالے سے علی کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے؛ "میرے اہل بیت کے وہ لوگ جاتے رہے جو اللہ کے دین کی حمایت میں میرے دست و بازو تھے۔ اب میں صرف ان دو حقیر آدمیوں میں گھرا ہوا ہوں جو جاہلیت کے زمانے کے قریب ہیں یعنی عقیل و عباس۔"

اب چونکہ اسی حقیر شخص کے صاحبزادے مسلم بن عقیل نے حسین کا ساتھ دیا تھا، اس لیے عقیل کے دن بھی پھر گئے۔ اب ان کا شمار بھی اہل بیت اور آل محمد میں ہونے لگا۔ نام کے ساتھ علیہ السلام کا بھی اضافہ ہوا اور اس قابل ہوگئے کہ اپنے دوسرے بزرگوں کے ساتھ حسین ان کے نام کی بھی دہائی دیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس افسانے میں مسلم کے ان دو خورد سال بچوں کا کوئی ذکر نہیں جنھیں ان کے ساتھ کوفہ جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مسلم کے مقتول ہونے کے بعد ان یتیموں پر جو گذری، اس پر بڑے طویل اور دلگداز مرثیے کہے گئے ہیں، لیکن افسوس ابو مخنف کے وقت تک ان دو عقیلی بچوں کا کوئی تصور تک نہ تھا، یہ ایجاد بعد کی ہے اور یہ مضامین غیب سے کسی اور وقت مرثیہ خوانوں پر القا ہوئے ہیں۔

- دوسری بات یہ ہے کہ اس پورے افسانے میں کہیں ان ابو بکر و عثمان کا نام تک نہیں جو حسین کے بھائی اور علی کے فرزند تھے۔ کربلا میں مقتول ہونے کے باوجود غالباً اپنے ناموں کی وجہ سے وہ اس قابل نہ رہے کہ ان کی طرف کوئی اشارہ بھی کرتا۔

- نام تو خیر عمر بن علی کا بھی نہیں لیا جاتا ہے۔ حسین کو سمجھانے والوں میں ان کے ایک بھائی محمد بن علی کا تو ذکر کیا ہے، لیکن ان کے دوسرے بھائی عمر بن علی کو محض نام کی خاطر ذکر اہل بیت سے خارج کر دیا گیا، حالاں

کہ انھوں نے بھی حسین کو روکنے کی کوشش کی تھی اور جب حسین نے انھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو قوت کے ساتھ انکار کر دیا۔

- یہاں ایک استفسار کی وضاحت کر دوں کہ محمد بن علی بن ابی طالب کو ابن الحنفیہ کیوں کہا جاتا ہے؟ اگر اسی پوسٹ پر رسمی جواب دے دیا گیا تھا کہ وہ اپنی والدہ خولہ بنت جعفر ابن قیس کے قبیلہ بنی حنفیہ کی مناسبت سے مشہور ہوئے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ محمد بن علی اپنے تمام بھائیوں بشمول حسن و حسین کے علم وفضل کے اعتبار سے کافی برتر تھے، اس لیے ان کی حیثیت کم کر کے دکھانے کی سبیل یہ نظر آئی کہ انھیں ابن الحنفیہ کہہ کر دوسروں پر یہ تاثر دیا جائے کہ فاطمہ کے فرزندوں کے مقابلے میں وہ کم حیثیت ہیں، حالاں کہ اسلامی شریعت کے اعتبار سے بیٹے کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے، خواہ وہ بیوی سے ہو یا ام الولد سے۔ عرب اس معاملے میں بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں، چنانچہ ایک عربی شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہمارے بیٹے وہ ہیں جو ہمارے بیٹوں کی اولاد ہوں، ہماری بیٹیاں تو ان کے بیٹے دوسرے لوگوں کی اولاد ہوتے ہیں۔"

محمد بن علی کو ابن الحنفیہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ زین العابدین کو بھی علی بن السندھیہ کہا جاسکتا ہے، چونکہ ان کی والدہ تو ساری عمر ام لولد رہیں، جب کہ محمد بن علی کی والدہ چونکہ عربی النسل تھیں، اس لیے عمر فاروق کے حکم سے علی نے انھیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ دراصل فاطمیت کا تصور اہل عجم کا پیدا کردہ ہے، اسی فاطمیت کے تحت یہ تصور عام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فاطمہ، پیغمبر اسلام کی اکلوتی بیٹی تھیں جو ظاہر ہے کہ قرآن کا انکار ہے، "یا ایھا النبی قل الازواجک و بناتک و نسا المومنین" (اے نبی کہہ دو اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلم خواتین سے)۔ خیر یہ علیحدہ بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

- ابو مخنف نے علی اکبر اور علی اصغر (زین العابدین) اور سکینہ کا تو ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ ایک موہوم شیر خوار بچے کا بھی، لیکن سکینہ کی بڑی بہن فاطمہ کا کوئی ذکر نہیں، حالاں کہ وہ اپنے شوہر حسن المثنیٰ بن الحسن بن علی بن ابی طالب کے ساتھ کربلا میں موجود تھیں۔ ان کا ذکر نہ کرنے کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ حسن المثنیٰ نے کوئی

کارنامہ نہیں دکھایا اور وہ کربلا سے زندہ واپس آئے۔ پھر انھوں نے یزید سے بیعت کی، حتیٰ کہ اس بیعت کے تعلق سے وہ اتنے ایمان دار رہے کہ یزید کی موت کے بعد بھی انھوں نے ابن زبیر سے بیعت نہیں کی۔ لہٰذا انھیں اہل بیت اور امامت سے محروم کر دیا گیا۔ حسین کے سگے بھتیجے اور داماد کے علاوہ بیٹی فاطمہ بھی صرف اس لیے قابل نہیں رہی، چونکہ نہ صرف وہ اپنے شوہر کے موقف کی قائل رہی بلکہ اس نے اپنے شوہر حسن المثنیٰ کے انتقال کے بعد اپنا نکاح ثانی اموی خاندان میں کر لیا جن سے حسین کے اموی نواسے محمد اور قاسم پیدا ہوئے اور نواسی رقیہ۔

فاطمہ بنت الحسین کا نام اہل بیت میں شمار نہ ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی والدہ ام اسحاق، طلحہ کی بیٹی تھیں۔ جی ہاں، وہی طلحہ جو صحابیِ رسول تھے لیکن انھوں نے علی کی بیعت نہیں کی تھی، حتیٰ کہ جنگ جمل میں ان کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور شہید ہوئے۔ انھی طلحہ کی بیٹی ام اسحاق سے پہلے حسن ابن علی نے نکاح کیا اور ان کی وفات کے بعد حسین نے اپنی بھاوج سے نکاح کر لیا جن سے فاطمہ بنت حسین پیدا ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل تشیع کو یہ کیوں گوارا ہوگا کہ اس فاطمہ بنت حسین کو اہل بیت میں شمار کیا جائے جو اس طلحہ کی نواسی تھیں جن پر لعنت بھیج جاتی ہے۔

- حسن المثنیٰ کے دوسرے بھائی زید کا بھی ابو مخنف کی کتاب میں ذکر نہیں ہے، حالاں کہ وہ بھی حادثہ کربلا میں زخمی ہوئے اور ان کا سرکاری علاج ہوا۔ شام جانے والے قیدیوں میں وہ بھی شامل تھے لیکن ان کا بھی وہی موقف تھا جو ان کے بھائی کا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی بیٹی نفیسہ کا نکاح اس اموی خلیفہ ولید اول سے کر دیا جس سے فاطمہ نے اپنے پہلے شوہر کے انتقال کے بعد کیا تھا، یعنی دونوں چچازاد بہنیں ایک ہی اموی خلیفہ کی بیویاں تھیں۔

- سکینہ بنت حسین کو اس افسانے میں خورد سال دکھایا گیا ہے جب کہ وہ کربلا کے زمانے میں جوان اور شادی شدہ تھیں۔ یہ وہی سکینہ ہیں جن کے متعلق بعد کے لوگوں نے یہ روایت وضع کی ہے کہ وہ شام کے قید خانے کے ظلم سہہ سہہ کر جان سے گئیں، چونکہ نوحہ خوانوں اور ذاکرین کو سینہ کوبی بھی تو کرنی تھی اور واقعہ

کربلا کو حق و باطل کی جنگ کیسے قرار دیا جاتا۔ ابو مخنف نے ایسا کوئی ذکر اپنے کتابچے میں نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ سب خواتین کو عزت و احترام کے ساتھ مدینہ واپس بھیج دیا گیا۔

- اس افسانے میں کہیں بھی رباب کا ذکر نہیں جو سکینہ کی والدہ اور حسین کی چہیتی بیوی ہیں۔ ان ماں بیٹی کے بارے میں حسین کے شعر مشہور ہیں، جو "المعارف ابن قتیبہ و طبری، جلد 13، صفحہ 199" میں مرقوم ہیں:

"تیری عمر کی قسم میں اس گھر سے بلا شبہ محبت کرتا ہوں جہاں سکینہ اور رباب میزبانی کرتی ہیں۔"
"میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، پھر ان پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں، اس میں کسی ملامت کرنے والے (ناصح) کی ملامت کا کوئی موقع نہیں۔"
"میں ان (ناصحین) کی بات زندگی بھر ماننے کا نہیں، یہاں تک کہ میں قبر میں چلا جاؤں۔"

رباب کو اہل بیت اور واقعہ کربلا میں شامل نہ کرنے کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ رباب، یزید کی والدہ میسون کی قریب ترین عزیزہ تھیں یعنی سکینہ اور رباب کا شام جانا گویا اپنے ہی گھر جانا تھا، ماں کا مائکہ تھا اور بیٹی کا ننھیال۔

- علی بن حسین (زین العابدین) کو واقعہ کربلا کے موقع پر اس کتاب یعنی "مقتل الحسین" میں خورد سال اور بیمار دکھایا گیا ہے، جب کہ وہ اس وقت صاحب اولاد یعنی دو بیٹوں کے باپ تھے (نسب قریش، صفحہ 59)۔ واقعہ حرہ کے وقت جب اہل مدینہ نے اموی سادات کو شہر سے نکال دیا تھا تو مروان کے اہل و عیال کو علی اپنی جاگیر ینبع پر لے گئے تھے (دیکھیے، انساب الاشراف، جز و نمبر 4، مطبوعہ ہیبرو یونیورسٹی)۔ پھر جب مروان شام پہنچ گئے تو ان کے فرزند اکبر کی معیت میں ان کے اہل عیال کو شام بھیج دیا۔ اب ظاہر ہے، اگر وہ 64 ہجری میں اس عمر کے تھے کہ شامی قافلہ میں سفر کر سکیں تو واقعہ کربلا میں یقیناً دس بارہ سال کے ضرور ہوں گے۔ لیکن افسوس، ان سے چونکہ نسل نہیں چلی، اس لیے وہ سلسلہ امامت سے تعلق بھی نہیں رکھتے اور پھر وہ غیر سیاسی شخص بھی تھے۔

ان کا نام ضمناً کبھی کبھی آجاتا ہے لیکن ان کے چھوٹے بھائی محمد باقر کو بڑا بنا دیا گیا، جب کہ تاریخ پیدائش 57 ہجری ہے یعنی واقعہ کربلا میں وہ دو تین برس کے تھے۔

محض یزید سے ان کی بیعت کو بے وقعت کرنے کی غرض سے دو بیٹوں کے باپ کو خورد سال بتایا گیا ہے، حالاں کہ پانچ برس کی عمر میں علی کا ایمان لانا ایسا اہم ہو گیا کہ انھیں اول المسلمین کہنے پر اصرار ہے۔

یزید کے خلاف ابن زبیر نے جب تحریک اٹھائی اور اہل مدینہ سے بغاوت کر دی تو زین العابدین نے اس تحریک سے کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ مدینہ سے ہی چلے گئے (انساب الاشراف بلاذری)۔ زین العابدین نے مختار ثقفی کی تحریک سے بھی کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ اموی خلافت کی تائید کی اور عبد الملک کی بیعت میں داخل ہو گئے۔ اگر ان کی بیعت یزید اور دوسرے اموی خلفا سے تقیہ پر مبنی تھی تو اسی تقیہ کے تحت وہ ابن زبیر سے بھی بیعت کر سکتے تھے لیکن اس کے بر خلاف وہ ان کی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے بیعت سے صاف انکار کر دیا۔

- سب سے دلچسپ بات یہ کہ خواتین آل بیت میں علی بن حسین المعروف زین العابدین کی والدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالاں کہ وہ واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔ ان کی والدہ سندھی خاتون تھیں۔ امام ابن قتیبہ، ابن سعد اور طبری؛ سب نے اس کی توثیق کی ہے اور ساتھ کہا ہے کہ حسین کے قتل ہو جانے کے بعد زین العابدین نے اپنی ولایت میں اپنی والدہ کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید سے کر دیا تھا جن سے عبد اللہ بن زید پیدا ہوئے۔ ابو مخنف کے وقت تک شہر بانو نام کا وجود تک نہ تھا جسے زین العابدین کی خیالی ماں قرار دیا جاتا ہے اور جس کا رشتہ تخت کیانی سے جوڑا جاتا ہے۔ ذرا سوچیے، یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ زین العابدین کو ان کی اپنی والدہ سے چھین کر ایک خیالی کردار کی گود میں ڈال دیا گیا۔

- ابو مخنف نے اپنے مقتل میں ام کلثوم بنت علی کو کربلا میں موجود بتایا ہے جب کہ یہ غلط ہے۔ ام کلثوم علی کی پہلوٹی کی اولاد تھیں اور سب بہن بھائیوں سے بڑی، خود ابو مخنف کا بیان اس کا ثبوت ہے۔ بعد کے لوگوں نے حسن کو پہلی اولاد مشہور کر دیا۔ ام کلثوم کا پہلا نکاح عمر فاروق سے ہوا، ان سے زید پیدا ہوئے جو لاولد رہے اور ایک بیٹی

رقیہ ہوئیں۔ عمر فاروق کے قتل ہونے کے بعد ام کلثوم عون بن جعفر بن ابی طالب کے نکاح میں آئیں اور ان کی وفات کے بعد؛ جو واقعہ کربلا سے بہت پہلے ہوئی تھی، ان کے بھائی محمد الاکبر نے ام کلثوم سے نکاح کر لیا تھا۔ محمد الاکبر کربلا نہیں گئے تھے تو اس کا امکان ختم ہو جاتا ہے کہ ام کلثوم وہاں موجود تھیں۔

- بلاشبہ زینب بنت علی کربلا میں موجود تھیں، حالاں کہ ان کے شوہر عبد اللہ بن جعفر نے انھیں وہاں جانے سے روکا تھا، کیوں کہ وہ حسین کے اس اقدام کے سخت خلاف تھے اور بڑی کوشش کی تھی کہ وہ مکہ نہ چھوڑیں۔ انھوں نے امیر مکہ سے اس بارے میں ایک فرمان بھی حاصل کر لیا تھا کہ حسین واپس آجائیں تو ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے لیکن موصوف نہ مانے۔ زینب جب بھائی کے ساتھ جانے پر مصر ہوئیں اور شوہر کے روکنے کے باوجود نہ رکیں تو جعفر نے انھیں طلاق دے دی (جمہرۃ النساب، ابن حزم، صفحہ 33)۔ زینب سے جو اکلوتے فرزند علی زینبی تھے، انھیں بھی باپ نے روک لیا۔ ام کلثوم نے اپنے شوہر جعفر طیار کی وفات پا جانے کے بعد عبد اللہ بن جعفر سے نکاح کر لیا۔ المختصر ام کلثوم کا کربلا میں موجود ہونا اور پھر قید ہو کر شام جانا محض افسانہ ہے۔ وہ اپنے دونوں شوہروں کے موقف پر ڈٹی رہیں اور حسین کے خروج کے خلاف تھیں۔

- ابو مخنف نے واقعہ کربلا میں عون الاصغر کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کے مشہور بھائی محمد کا ذکر نہیں کیا جن پر بڑے دل گداز مرثیے لکھے گئے ہیں اور انھیں زینب کا فرزند باور کرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کس طرح دونوں نو عمر بچے اپنی والدہ کے حکم سے اپنے ماموں جان پر قربان ہوئے۔ جب کہ یہ عون اور محمد زینب کے فرزند نہیں بلکہ عون کی ماں جمانہ بنت مسیب فرازی تھیں اور محمد کی ماں حفصہ بن بکر تھیں (انساب قریش، صفحہ 83)۔ زینب کے بطن سے ابن جعفر کے فرزند علی زینبی تھے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور جو اپنے والد کے حکم پر اپنی والدہ کے ساتھ کربلا گئے ہی نہیں تھے۔

- سب سے دلچسپ بات تو یہ کہ عون اور محمد بچے نہیں تھے بلکہ صاحب اولاد کڑیل جوان تھے۔ دوسری مزے کی بات یہ کہ عون تو کربلا میں ہو ہی نہیں سکتے تھے چونکہ وہ اس واقعہ سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ ہاں، محمد اصغر بن جعفر اس قافلے میں ضرور موجود تھے لیکن وہ بنت حفصہ بن بکر کے بطن سے تھے، نہ کہ زینب کے بطن سے۔

میں نے یہاں ابو مخنف کے متذکرہ کتابچے "مقتل الحسین" کے صرف ایسے کچھ اہم پہلوؤں کو نشان زد کر دیا ہے جو آگے کی منزلوں میں کام آئیں گے، بقیہ محاسبہ اور تنقیدی جائزہ ساتھ ساتھ کیا جاتا رہے گا۔

خلافت یزید اور حسین کا خروج

معاویہ کی وصیت

. کلبی (بتایا جاچکا ہے کہ ابو مخنف سے جو شخص روایت کرتا ہے، اس کا نام ہشام کلبی ہے، تاریخ طبری میں چند ایک کو چھوڑ کر بقیہ تمام روایات انھی دونوں سے مروی ہیں) نے ایک روایت یہ کی ہے کہ جب معاویہ کی وفات کا وقت قریب آیا اور مرض نے بہت شدت اختیار کرلی تو اس وقت یزید اس کے پاس موجود نہ تھا۔ کلبی کہتا ہے کہ اس وقت وہ یعنی یزید حمص کا والی تھا۔ لہٰذا معاویہ نے کاغذ قلم و دوات منگا کر اس کے نام یہ خط لکھا۔ میں اس خط کو طوالت کے سبب پورا نقل نہیں کر رہا، صرف اس حصے کو نقل کر رہا ہوں جسے ایک حلقہ بطور ثبوت پیش کرتا رہا ہے:

"بیٹے میں نے تمھاری طرف سے پوری دوڑ بھاگ کرلی ہے۔ ہر چیز ہموار کردی ہے، دشمنوں کو زیر کردیا ہے، کُل عرب کی گردنیں، تیرے لیے جھکادی ہیں۔ اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت میں تجھ سے نزاع کرے۔ یہ چار ہیں؛ حسین ابن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔ پس عبداللہ بن عمر کی بات تو یہ ہے کہ کثرت عبادت نے اب انھیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے۔ جب یہ دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کرلی ہے تو وہ بھی کرلیں گے، رہے حسین بن علی تو عراق والے انھیں تیرے مقابلے پر نکالے بغیر چھوڑیں گے نہیں، اگر ایسا ہی ہوا اور وہ خروج کر بیٹھیں اور تم ان پر قابو پاؤ تو درگذر کرنا، اس لیے کہ بہت قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے۔ تیسرے ابن ابی بکر ہیں، وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کا میدان تو بس عورتیں اور ایسی ہی دوسری لذتیں ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شیر کی طرح گھات لگائے گا اور لومڑی والی وہ چالیں چلے گا کہ ذرا تو اسے موقع دے تو

وہ تجھ پر جست لگائے، وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ہی کر ڈالنا۔" (طبری، جلد6، صفحہ 179-180)

اس وصیت میں جھوٹ کی آمیزش ہے، جس کی شہادت اس وصیت میں شامل صرف ایک نام سے ہو جاتی ہے اور وہ نام ہے عبدالرحمٰن بن ابی بکر جو اس وقت دنیا میں موجود ہی نہ تھے اور معاویہ کی وفات کے سات سال پہلے 53 ہجری میں فوت ہو چکے تھے (الاستعیاب، جلد2، صفحہ 393)۔ جو شخص زندہ ہی نہ تھا اس کا وصیت میں ذکر چہ معنی دارد؟

اس وصیت کے مقابلے میں طبری ہی نے آگے کی چند سطروں کے بعد ایک اور وصیت نامہ درج کیا ہے، جو یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم لوگوں کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دیا جائے، اس وصیت میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا ذکر نہیں ہے۔ اس وصیت کا لب ولہجہ بھی پہلی وصیت کے مقابلے میں دوراندیشانہ ہے جو معاویہ جیسے معاملہ فہم شخص کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس وصیت کی روایت طبری میں کچھ یوں درج ہے:

"جب معاویہ کا وقت 60 ہجری میں پورا ہوا اور یزید اس وقت موجود نہ تھے تو انھوں نے ضحاک بن قیس فہری جو ان کے پولیس افسر تھے اور مسلم بن عقبہ المری کو بلایا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہونچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھو جو تمھاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمھارے پاس آوے، اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو، اس کی خبر رکھو اور عراق والوں کا بھی یہ خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کر دو۔ اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف حرکت میں آویں۔ اور اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انھیں کو تمھارے رازداروں کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب مہم تمام ہو جائے تو انھیں ان کے ملک کو واپس کر دو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی خصلتیں اختیار کر لیں گے اور (آخری بات یہ ہے کہ) مجھے قریش میں بس تین آدمیوں کی طرف سے (تمھاری مزاحمت کا) اندیشہ ہے؛ حسین بن علی، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر۔ عبداللہ بن عمر کا جہاں تک سوال ہے تو دین (کی شدت) نے انھیں بالکل توڑ ڈالا ہے، وہ اپنی (ذات سے) تمھارے مقابل کسی شے کے خواہاں نہ ہوں گے۔ رہے حسین بن علی تو وہ

ذرا ہلکے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے سہارا چھوڑا، انھیں کے ذریعہ اللہ تمھاری طرف سے بھی ان کو کافی ہو جائے گا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا حق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہل عراق میدان میں لائے بغیر چھوڑیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم ان پر قدرت پاؤ تو درگذر کرنا کیوں کہ اگر میرے اور ان کے درمیان ایسی صورت پیش آئی تو میں درگذر ہی کرتا اور ہاں، وہ جو ابن زبیر ہے وہ زبردست داؤں باز ہے۔ وہ سامنے آجائے تو کسر نہ چھوڑو، ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کر لینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے، اس کو بہنے سے بچانا۔" (طبری، جلد6، صفحہ 180)

بہر حال، اتنا تو ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ کم سے کم ان تین حضرات کے بارے میں جو معاویہ کی وفات کے وقت زندہ تھے، انھوں نے یزید کو کچھ وصیت کی تھی۔ محمود احمد عباسی نے اپنی معروف اور متنازعہ فیہ کتاب "خلافت معاویہ و یزید" میں ان دونوں وصیتوں کا انکار کیا ہے جو بلا دلیل ہے۔ وہ یہ نہیں تسلیم کرنا چاہتے کہ یزید کی ولیعہدی کے مسئلہ میں جو لوگ؛ خواہ گنتی کے تین چار ہی کیوں نہ ہوں، کچھ اہمیت تھی۔ میں نے بھی معاویہ کی پہلی وصیت کو بوجوہ رد کیا ہے لیکن عباسی ان دونوں وصیتوں کی تردید کرتے ہوئے ایک تیسرا وصیت نامہ "البدایہ والنہایہ" کے حوالے سے درج کر دیتے ہیں، حالاں کہ اس وصیت نامہ میں مضمون کے اعتبار سے کوئی ایسی بات نہیں جس سے اختلاف کرنے کی ضرورت سمجھی جائے لیکن جس وصیت کو (جو طبری کی روایت ہے اور البدایہ والنہایہ میں بھی منقول ہے) عباسی صاحب ردی کی ٹوکری کی نذر کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی کوئی معقول وجہ وہ پیش نہ کر پائے، لہٰذا ان کی تردید بے وزن ہے۔

یزید بن معاویہ کا فرمان

ابو مخنف کے مطابق، یزید نے خطبہ دینے کے بعد جو پہلا کام کیا، وہ تھا ولید بن عتبہ کو خط لکھنا جو مدینہ کا والی تھا۔ اس خط کی ابتدا یوں تھی؛

"اے ابو محمد! جب تم یہ خط پڑھ لو تو سب لوگوں سے اپنے ہاتھ پر میرے لیے بیعت لو، اور خاص طور پر ان چار سے یعنی عبد اللہ بن ابی بکر، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس اور حسین بن علی سے، اور میرا یہ خط انھیں دکھا دینا۔ اب اگر ان میں سے کوئی بیعت نہ کرے تو اس خط کے جواب کے ساتھ اس کا سر بھی میرے پاس روانہ کر دینا۔" (طبری، جلد6، صفحہ 188)

یزید کا یہ فرمان بھی معاویہ کی پہلی وصیت کی طرح جھوٹا ہے، چونکہ اس فرمان میں بھی عبد الرحمٰن بن ابی بکر کا ذکر ہے جو سات سال پہلے ہی وفات پا چکے تھے، تو پھر یزید، کسی مرحوم سے بیعت لینے کا حکم کیوں کر دے سکتا تھا؟

ابو مخنف کہتا ہے کہ ولید کے پاس جب قاصد پہنچا تو اس نے پہلے خط پڑھا، پھر مروان کو طلب کیا جو معاویہ کی جانب سے مدینہ کا والی رہ چکا تھا اور اب حکومت سے معزول کیا جا چکا تھا۔ جب مروان، ولید کی طلبی پر وہاں پہنچا تو اسے خط پڑھ کر سنایا اور اس سے مشورہ مانگا۔ مروان نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان (چاروں) کو بلائیں اور ان سے بیعت اور فرماں برداری کا مطالبہ کریں۔ انھوں نے ایسا کر لیا تو ان کی بیعت قبول کر لیں اور اگر انکار کیا تو ان سب کی گردن مار دیں، کیوں کہ معاویہ کی وفات کا علم ہونے پر ان میں سے ہر شخص اپنی حکومت کا طالب ہو گا۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ اس نے یعنی امیر ولید نے ان چاروں کی طلبی کے لیے اپنے آدمی بھیجے۔ وہ سب رسول اللہ کے روضہ شریف پر مجتمع تھے، چنانچہ قاصد نے وہاں پہنچ کر انھیں ولید کا پیغام دیا کہ آپ سبھوں کو بلایا ہے۔ ان حضرات نے کہا، واپس جاؤ۔ جب وہ چلا گیا تو عبد اللہ بن زبیر نے حسین سے کہا اے فرزند رسول، آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ولید ہم سے کیا چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں معاویہ ہلاک ہو گیا ہے اور اس نے اپنے بیٹے کو حکومت سپرد کر دی ہے۔ ولید نے آپ لوگوں کو اس لیے بلایا ہے کہ یزید کی بیعت کر لیں۔ اب بتایئے آپ کا کیا ارادہ ہے۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ عبد الرحمٰن بن ابی بکر (جو سات سال پہلے دنیا سے کوچ کر چکے تھے، لیکن راوی نے انھیں قبر سے کھود نکالا) نے کہا؛ بھئی، میں تو اپنے گھر میں فروکش ہو کر دروازہ بند کر لوں گا۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا، رہا میں اور میرا کام تو بس قرآن سے ہے، محراب سے ہے اور علم سے ہے۔ ابن زبیر نے کہا، میں تو یزید سے

کبھی بیعت نہیں کروں گا۔ حسین نے فرمایا؛ میں تو اپنے جوانوں کو جمع کر کے گھر کے باہر چھوڑ دوں گا اور پھر ولید کے پاس اندر جاؤں گا۔ پھر میں اس سے بحث کروں گا اور وہ مجھ سے، یوں میں اپنا حق مانگوں گا۔ اس پر عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ مجھے آپ کے بارے میں اس کی طرف سے اطمینان نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کے پاس اس طرح سے جاؤں گا کہ اس کے شر سے محفوظ رہنے کا پورا انتظام ہو گا، انشا اللہ۔

پھر حسین اپنے گھر گئے اور اپنے بیٹوں اور غلاموں کو بلایا۔ جب وہ لوگ آگئے تو آپ انھیں ساتھ لے کر ولید کے گھر گئے اور ان لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ میں اس شخص کے پاس جا رہا ہوں، اگر تم سنو کہ میری آواز بلند ہے تو جھپٹ کر اندر آجانا، ورنہ اپنی جگہ پر رہنا تا آنکہ میں تمھارے پاس واپس آجاؤں۔

حسین کا ٹال مٹول

پھر آپ ولید کے پاس گئے اور اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا۔ مروان بن حکم اس کے پاس بیٹھا تھا۔ حسین نے کہا؛ اللہ آپ دونوں کے احوال درست رکھے۔ لیکن دونوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب حسین اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تو اس نے یعنی امیر ولید نے یزید کا مکتوب انھیں پڑھنے کو دیا، معاویہ بن ابی سفیان کی وفات کی اطلاع دی اور یزید کی بیعت طلب کی۔

حسین نے فرمایا: اناللہ و انا الیہ راجعون۔ یہ بڑی سخت مصیبت پڑی ہے اور اس عالم میں ہمیں بیعت پر توجہ کی فرصت نہیں۔

ولید نے کہا یہ بہت ضروری ہے۔ حسین نے فرمایا، مجھ جیسا شخص خفیہ بیعت نہیں کر سکتا اور نہ ہی آپ اس سے مطمئن ہوں گے لیکن جب بھی آپ نکلیں اور لوگوں کو بیعت کے لیے طلب کریں تو انھی کے ساتھ ہمیں بھی بلا لیجیے گا اور میں بیعت کرنے والوں میں پہلا شخص ہوں گا۔

یہاں اس کہانی کو درست فرض کر کے تجزیہ کر لیں، دو نتائج نکلتے ہیں:

1. حسین، یزید سے بیعت پر راضی تھے۔

2. حسین تقیہ یعنی جسے عرف عام میں ریاکاری کہتے ہیں، اس پر آمادہ تھے، حالاں کہ ولید کا رویہ نرم تھا، اس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر تھی بھی تو پھر حسین نے اس وقت تقیہ کیوں نہ کیا جب کربلا میں اپنے عیال کے ساتھ دشمن فوجوں سے گھرے ہوئے تھے؟ وہاں تو وہ فلمی ہیرو کی طرح داد شجاعت دینے کو ترجیح دے ڈالی اور بال بچے کٹوا ڈالے؟

خیر، ہم ان سوالوں کو مؤخر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور قصہ نویس کو اپنی بات پہلے ختم کر لینے دیتے ہیں۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ ولید کو معاملات کو بخوبی انجام پانا زیادہ عزیز تھا۔ اس لیے اس نے کہا، اے ابو عبد اللہ! آپ تشریف لے جائیں اور لوگوں کے ساتھ کل ہی ہمارے پاس تشریف لائیں۔ مروان نے اس سے کہا؛ لومڑی جب تمھارے ہاتھ سے نکل گئی تو بس پھر گرد و غبار ہی نظر آئے گا۔ ان کے نکل جانے کا خطرہ مول مت لو۔ یا تو بیعت کریں ورنہ ان کی گردن ماردی جائے۔

حسین نے جب یہ بات سنی تو کھڑے ہوگئے اور کہا، "او کنجی آنکھ والی کے بیٹے! تو میرے قتل کا مشورہ دیتا ہے۔ او ناپاک عورت کے بیٹے، تو نے غلط کہا۔ تجھے اور تیرے آقا کو مجھ سے جنگ کا طویل تجربہ ہے۔" یہ کہہ کر آپ ان دونوں کے پاس سے چلے آئے اور اپنے گھر پہنچ گئے۔ مروان نے ولید سے کہا، "تم نے میرا کہنا نہ مانا اور میرے مشورے کی مخالفت کی۔ بخدا اب تم ان پر کبھی قابو نہ پاسکو گے۔"

ولید نے جواب میں کہا، "افسوس آپ نے میرے لیے وہ بات پسند کی جو میرے اور میری اولاد کے لیے تباہ کن ہو گی۔ بخدا اگر قیامت کے دن خون حسین کی جواب دہی میرے ذمہ ہو تو تمام دنیا کی حکومت مجھے منظور نہیں۔" مروان نے کہا، "تمھاری رائے اگر یہ ہے تو تم نے بڑا اچھا کام کیا اور تم بڑے اچھے امیر ہو مگر تم جیسوں کے لیے مناسب حال یہ ہے کہ میدانوں اور پہاڑوں میں سر کرتے پھرو۔ لیکن عوام اور غلفات و سلاطین کے معاملات سے تمھیں کچھ سروکار نہ ہو۔" یہ کہہ کر مروان ناراض ہو کر اس کے پاس سے چلا گیا۔ (طبری، جلد 6، صفحہ 189)

اب طبری کی اس روایت کے برعکس ابن کثیر نے محمد بن سعد کی حوالے سے دوسری روایت پیش کی ہے، اس روایت کے مطابق حسین کے ساتھ ابن زبیر بھی تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ آگے کچھ یوں لکھا ہے:

"اور یہ بات یوں ہوئی کہ ولید نے حسین کے ساتھ سخت کلامی کی تھی، پس حسین نے بھی اس کو سخت سست کہا اور اس کے سر سے عمامہ کھینچ لیا........ اس پر مروان یا کوئی مصاحب بولا کہ گردن مار دینی چاہیے۔ ولید نے کہا کہ نہیں، بنی عبد مناف کا یہ خون بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ ہے۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 163)

اس روایت میں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے، حتیٰ کہ پگڑی کھینچنے تک کی نوبت پہنچ گئی۔ اب ہم ان دونوں روایات کا جب موازنہ کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ طبری کی روایت میں یزید کی طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سخت کلامی منسوب کی گئی ہے، ان دونوں باتوں کا الحاقی کاروائی سمجھا جائے۔ چونکہ رجب 60 ہجری سے لے کر محرم 61 ہجری تک (یعنی واقعہ کربلا تک)، طبری کی اس ایک روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حسین کے بارے میں یزید کے سخت رویہ کی شہادت دیتی ہو۔ پھر دوسری جانب یہ بھی دیکھیے کہ حسین اس دوران یزید کی بیعت سے بچ کر مدینے سے مکہ چلے گئے، پھر مکہ میں چار پانچ ماہ مقیم بھی رہے جس میں کوفہ جانے کی تیاری ہوتی رہی، خط و کتابت اور نمائندوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس پورے عرصے کے دوران حسین کو صرف سمجھانے بجھانے کا سلسلہ جاری رہا، نہ کہ ان پر یزید یا حکام سے کوئی سختی کی گئی۔ چلیے، کسی اور کی نہیں، میں امام باقر کی ایک روایت پیش کرتا ہوں جس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یزید کی بیعت کے سلسلے میں حسین پر کوئی سختی نہیں کی گئی۔ ابن جریر طبری اپنی سند بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہم سے عمار دہنی نے بیان کیا کہ میں نے ابو جعفر (امام باقر) سے عرض کی کہ مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنا دیجیے کہ جیسے میں وہاں موجود تھا، اس پر آپ نے فرمایا کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان اس وقت حاکم مدینہ تھے، پس انھوں نے یزید کی بیعت کے لیے حسین کو بلاوا بھیجا۔ آپ نے کہا کہ ذرا مؤخر کر دو اور نرمی برتو، اس نے مؤخر کر دیا، تب آپ مکے کے لیے نکل گئے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 194)

مروان بن حکم

مروان کوئی ایرے غیرے شخص بھی نہیں تھے، بلکہ ان کا شمار صغار صحابہ اور کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ صحیح بخاری، موطا اور سنن نسائی وغیرہ جیسے صحاح میں مروان کے ارشادات، فتاویٰ اور قانونی فیصلے مندرج ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ان کے متعلق خیال ہے، "اہل صحاح نے مروان سے متعدد احادیث لی ہیں اور اہل فتویٰ میں ان کا قول بطور سند مقبول ہے۔" جنگ جمل کے بعد مروان اور ان کے صاجزادوں نے علی سے بیعت کر لی تھی اور مدینہ واپس ہو گئے تھے۔ جنگ صفین میں انھوں نے معاویہ کا ساتھ نہ دیا اور دوسرے اکابر صحابہ کی طرح غیر جانب دار رہے۔ مروان کے فرزند (امیر المومنین) عبد الملک کے عقد میں علی کی ایک دختر تھیں جن سے اولاد ہوئی (البدایہ والنہایہ، جلد 9، صفحہ 69)۔ ان کے دوسرے فرزند معاویہ بن مروان بھی علی کے داماد تھے، ان کی زوجہ کا نام رملہ بنت علی تھا۔

درج بالا تمام باتوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حسین سب کا مشورہ ٹھکرا کر کوفہ کی سمت گامزن ہو ہی گئے تو مروان نے عبید اللہ بن زیاد کو یہ خط بھیجا تھا جسے "ناسخ التواریخ" کے شیعہ مصنف نے بھی نقل کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"اما بعد! حسین بن علی تمھاری طرف چل پڑے ہیں۔ یاد رکھو، حسین فاطمہ کے بیٹے ہیں اور فاطمہ رسول اللہ کی بیٹی ہیں، خدا کی قسم خدا انھیں سلامت رکھے، ہمیں حسین سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں۔ خبر دار ایسا نہ ہو کہ تم نفس ہیجان میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو جس کا مداوا نہ ہو سکے اور عوام اسے بھلا نہ سکیں اور قیامت تک اس کا تذکرہ ہوتا رہے۔" (ناسخ التواریخ، کتاب دوم، جلد 6، صفحہ 165، طبع ایران)

اب ذرا اس مروان بن حکم کے ان مشفقانہ الفاظ کا ابو مخنف کی کہانی کے مروان سے موازنہ کر کے دیکھیں تو حقیقت صاف کھل کر سامنے آ جاتی ہے، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے فرض کر بھی لیا جائے کہ مروان نے ولید کو جو مشورہ دیا تھا اور جسے ولید نے ماننے سے انکار کر دیا، اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہی ہوا جس کی پیش گوئی مروان نے کر دی تھی کہ حسین کو وقت نہ دو، یہ ایک بار ہاتھ سے نکل گئے تو دوبارہ ہاتھ نہ آئیں گے۔ حسین نے پہلے تو ولید کو یہ کہا کہ وہ خفیہ بیعت کی بجائے علانیہ بیعت یعنی مجمع کے سامنے کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، لیکن

اگلے دن جب حکام انھیں لینے پہنچے تو حسین نے کہا، صبح ہو جائے پھر دیکھیں گے۔ اس پر بھی حکام کے لوگوں نے ان پر جبر نہیں کیا، لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ راتوں رات مدینہ سے نکل گئے (طبری، 5/ 341)۔ کیا یہاں مروان بن حکم کے یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت نہ ہوئی؛"؛لومڑی جب تمھارے ہاتھ سے نکل گئی تو بس پھر گرد و غبار ہی نظر آئے گا۔"

حسین خوشامدیوں کے نرغے میں

حسین کی اس وعدہ خلافی کے باوجود یہ دھیان رکھیے، مکہ میں بھی ان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر باز پرس نہیں ہوئی، حالاں کہ یزید کی خلافت کے دائرے سے مکہ باہر تو نہ تھا۔ وہ یا اس کے حکام چاہتے تھے تو حسین پر سرکاری اقدامات کے تحت سخت کاروائی کر سکتے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ حسین اپنی باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے اور یزید کی صلہ رحمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ اس وقت کوفہ کا والی نعمان بن بشیر انصاری تھا(یہ صحابی رسول تھے)۔ بہر حال کوفیوں کا ایک گروپ سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر جمع ہوا اور طے یہ پایا کہ حسین کو پھر خط لکھا جائے۔ اس خط میں حسین کو خروج کی ترغیب دی گئی اور ان سے آخری سطور میں یہ درخواست کی گئی کہ اگر آپ خود نہ آئیں تو اپنے گھر والوں میں سے کسی کو ہمارے پاس بھیج دیں، جو خدا کے حکم اور آپ کے جد رسول اللہ کی سنت کے مطابق آپ کے احکام جاری کرے۔ یہ خط انھوں نے عمر بن نافذ تمیمی اور عبد اللہ بن سمیع ہمدانی کے ہاتھ روانہ کیا۔ راوی کے مطابق ان دونوں کے پاس 500 خط اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک خط کا مضمون یوں تھا، " پھل پک کر تیار ہو چکے ہیں۔ اے رسول خدا کے نواسے آپ جلدی سے ہمارے پاس آجائیے۔" ناسخ التواریخ کے شیعہ مصنف محمد تقی سپہر کاشانی نے بھی اس متن کو اپنی تالیف میں یوں درج کیا ہے، "امابعد، باغ و بوستان سر سبز ہو گئے ہیں، میوہ و پھل تیار ہیں، زمین میں سبزہ اُگ آیا ہے۔ اب موقع ہے کہ آپ اس فوج و لشکر کی جانب تشریف لے آئیں جو آپ کی ہر خدمت کے لیے موجود و مستعد ہے۔" (جلد6، صفحہ 174)

ایسا لگتا ہے کہ عزیزوں اور خیر خواہوں کے متواتر مشوروں اور دوسری طرف اہل کوفہ کے پیہم اصرار کے درمیان حسین گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھے، کبھی سفر کا ارادہ کرتے تھے، کبھی ترک کر دیتے تھے۔ ابو مخنف کے مطابق، پے بہ پے خطوط حسین کے پاس پہنچے تو آپ نے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اہل کوفہ نے ہانی بن ہانی اور سعید عبد اللہ حنفی کے ہاتھ ایک خط بھیجا۔ اہل کوفہ کی جانب سے یہ دونوں آخری قاصد تھے۔ حسین نے جب سارے خطوط پڑھ لیے تو ان کے جواب میں جو خط لکھا تھا، وہ اس طرح تھا؛

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حسین بن علی کی طرف سے گروہ مومنین کے نام۔ امابعد، ہانی اور سعید تمھارے خط لائے اور تمھاری قاصدوں میں یہ آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے۔ آپ لوگوں نے جو کچھ لکھا، وہ میں نے سمجھ لیا یعنی یہ کہ میرے علاوہ آپ لوگوں کا کوئی امام نہیں اور آپ لوگ مجھے اس غرض سے بلا رہے ہیں کہ شاید اللہ آپ کو سچائی اور ہدایت پر جمع کر دے، میں آپ لوگوں کے پاس اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیج رہا ہوں۔ یہ میرے گھر والوں میں سب سے افضل ہیں اور میں نے انھیں ہدایت کی ہے کہ آپ لوگوں کے جذبات خیر سگالی اور مواقف سے مجھے مطلع کریں تو میں آپ کے پاس آجاؤں گا۔ انشا اللہ تعالیٰ"

خط کے اس متن سے ظاہر ہے کہ حسین کوفیوں کی امداد و نصرت کے بھروسے پر سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے تشریف لے جانے پر آمادہ ہو رہے تھے، نہ کہ شجر اسلام کو اپنے اور اپنے عیال کے خون سے سینچنے جا رہے تھے۔

مسلم بن عقیل

.

اپنے حمایتی کوفیوں کو جواب لکھنے کے بعد حسین نے تحقیق حال کے لیے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل، جو ایک دوسرے رشتے سے ان کے بہنوئی بھی لگتے تھے، انھیں کوفہ بھیجا۔ مسلم کے ساتھ دو اور آدمی رہبری کے لیے لگا دیے۔ مسلم اپنے اعزہ و اقربا سے رخصت ہو کر روانہ ہو گئے۔ لیکن بقول ابو مخنف سفر کے دوران دونوں راہبر راستے سے بھٹک اور پیاس کی شدت سے مر گئے۔ اسی جگہ سے مسلم نے حسین کو خط بھیجا، جگہ کا نام مضیق تھا یعنی تنگی کی جگہ۔

مسلم بن عقیل کا عذر

مسلم کے خط کا متن کچھ یوں تھا: "اے دختر پیغمبر کے فرزند! میں آپ کو یہ خبر دیتا ہوں کہ دونوں راہ شناس جو میرے ہمراہ تھے، راستے سے بھٹک گئے اور پیاس کی شدت سے مر چکے ہیں۔ میں اس واقعہ کو بری فال سے تعبیر کرتا ہوں۔ اگر مناسب ہو تو مجھے (اس مہم سے) معافی دے کر کسی اور شخص کو بھیج دیں۔ والسلام۔"

اب مسلم نے حسین کو اس اجاڑ بیابان جگہ سے خط کیسے بھیجا، اس کا کوئی ذکر ابو مخنف نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کو توفیق ہوئی کہ اس سے پوچھے کہ ایسی جگہ جہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھے اور مسلم بن عقیل کے دونوں ساتھی پیاس کی شدت سے مر گئے، وہاں قاصد کون تھا اور خود حسین کا جواب آنے تک مسلم اس بے آب و گیاہ علاقے میں کیسے زندہ رہے؟ خیر صاحب، آگے چلیے، حسین کا جواب بھی آ گیا، لکھا تھا:

"اے برادر عم! میں نے اپنے جد رسول خدا سے سنا ہے کہ جو خود کسی واقعہ کو بد شگونی خیال کرے یا اس سے بری فال لی جائے اور وہ اسے صحیح تصور کرے، وہ ہم اہل بیت سے نہیں ہے۔ لہٰذا میرا یہ خط دیکھتے ہی میری سابقہ ہدایت پر عمل پیرا رہنا۔"

غور فرمایئے، رسول اللہ کے انتقال کے وقت حسین کی عمر محض تین سال تھی، تو انھوں نے اپنے نانا سے "خود" (براہ راست) یہ حدیث کہاں سے سن لی؟ یا تو ابو مخنف غلط روایت کر رہا ہے یا پھر حسین محض مسلم بن عقیل کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہیں۔

کوفہ میں

خیر صاحبو، حسین نے "چڑھ جا بیٹا سولی پر" کا حکم دیا اور مسلم نے فوراً تعمیل حکم کے طور پر اپنا سفر پھر سے جاری کر دیا۔ ابو مخنف کے مطابق مسلم رات کے وقت کوفہ پہنچے اور سلیمان بن صرد کے ہاں فروکش ہوئے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے ہاں ٹھہرے۔ یہ دوسرا نام یعنی مختار بن ابی عبیدہ ثقفی بڑا معروف نام اور پراسرار کردار ہے۔ یہ شخص واقعہ کربلا کے پانچ سال بعد بجلی کی کڑک کی طرح پوری امت مسلمہ پر گرا اور سال بھر کے اندر قیامت مچا کر گذر گیا۔ یہ خون حسین کے انتقام کے نام پر اٹھا تھا اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ ابن زیاد اور عمر وبن سعد وغیرہ جیسے تمام قاتلان حسین اسی کے حصے میں آئے۔ لیکن سوال اٹھتا ہے کہ حسن و حسین کے چچازاد بھائی یعنی مسلم بن عقیل کیا اس شخص کے مشتبہ کردار کو نہ جانتے تھے؟ زیادہ دن تو نہ گذرے تھے، جب علی اور معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری چل رہی تھی تو حسین کے بڑے بھائی یعنی حسن ابن علی چالیس ہزار کی فوج کو لے کر روانہ ہوئے اور مدائن کے قریب پڑاؤ ڈالا اور اسی جگہ کچھ فسادی حسن کے خیمے پر ٹوٹ پڑے، لوٹ مار مچائی اور انھیں زخمی کر دیا۔ مدائن میں علی کی طرف سے حاکم اسی مختار کے چچا سعد بن مسعود ثقفی تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حسن مدائن میں ان کی قیام گاہ پر آ گئے۔ جیسا کہ مورخین بتاتے ہیں کہ مختار نے اپنے چچا سے کہا، "چچا اگر دولت اور عزت کی ضرورت ہو تو انھیں باندھو اور معاویہ کے پاس پہنچا دو۔" چچا شریف تھے، انھوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ ابن بنت رسول کے ساتھ میں یہ حرکت کروں گا۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 92) کیا مسلم بن عقیل اس بات

سے ناواقف تھے کہ یہ شخص آل بیت کا دشمن تھا اور مشکوک کیرکٹر کا مالک تھا؟ "شہید انسانیت" کے مصنف علی نقی نے بھی اس پر صاد کیا ہے کہ مسلم نے مختار کے ہاں قیام کیا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق مسلم بن عقیل کا قیام مسلم بن عوسجہ کے یہاں ہوا تھا (طبری، جلد 6، صفحہ 194)۔ قاعدے سے تو ان کا قیام انھی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہیے تھا، جنھوں نے دعوتی خطوط لکھے تھے لیکن ان خطوط میں مختار اور مسلم بن عوسجہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

باغیانہ سرگرمیوں میں اضافہ

بہرحال، مسلم کے کوفہ پہنچتے ہیں سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ کوفہ کے لوگ دس دس بیس بیس یا اس سے کم و بیش مسلم کے پاس آتے رہے، یہاں تک کہ 80،000 لوگوں نے بیعت کرلی۔ مبالغہ کی بھی حد ہوتی ہے، اس وقت پورے کوفہ کی آبادی بھی اتنی نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ اتنی سرعت رفتاری سے کوفہ میں ہنگامی صورت پیدا ہو رہی تھی اور کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر (جو معاویہ کے زمانے سے کوفہ کے گورنر چلے آرہے تھے) کو اس وقت خبر ملے جب 80،000 لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ دیں؟ اگر اس تعداد میں لوگ بیعت کرچکے ہوتے تو صورت حال مختلف ہوتی، ایسا تو بالکل نہ ہوتا کہ اتنے سارے لوگ بغاوت پر آمادہ ہوں اور حکومت وقت کے خلاف احتجاج تک نہ کریں۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ جب یہ خبر کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر تک پہنچی تو وہ فوراً منبر پر گیا، خدا کی حمد اور پیغمبر پر درود بھیجنے کے بعد یوں کہنے لگا، "اے لوگو! خدا کی قسم اگر کوئی شخص مجھ سے جنگ نہیں کرے گا تو میں بھی اس سے جنگ نہیں کروں گا اور اگر کوئی شخص مجھ پر حملہ آور نہیں ہوگا تو میں بھی اس پر حملہ آور نہیں ہوں گا، اپنے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنے سے پرہیز کریں۔ اگر مجھے کسی شخص کے متعلق کچھ ایسا علم ہوگیا تو اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اگرچہ مجھے یہ کام تنہا بغیر کسی یار و مددگار کے کرنا پڑے۔"

عبداللہ بن شعبہ حضرمی مجمع سے اٹھا اور کہنے لگا: اے امیر! یہ معاملہ ظالمانہ جبر اور خونریزی کے بغیر حل نہیں ہوگا۔ یہ باتیں جو تم نے کی ہیں وہ شخص کرتا ہے جو اپنے آپ کو کمزور خیال کرتا ہے۔"

نعمان نے جواب دیا؛"میں خدا کے مقابلے میں اپنے تئیں کمزور سمجھتا ہوں لیکن ظالم لوگوں کے مقابلے میں ایسا نہیں ہوں۔" اس کے بعد وہ منبر سے اتر آیا۔

عبد اللہ بن شعبہ حضرمی نے نعمان کے اس جواب سے بد دل ہو کر یزید کو خط لکھا:

"خبر دار کہ مسلم بن عقیل کوفہ پہنچ چکے ہیں اور حسین کے شیعوں نے ان کی بیعت کرلی ہے۔ اگر کوفہ کی تجھے ضرورت ہے تو کسی دلیر آدمی کو یہاں بھیج، کیوں کہ نعمان کمزور آدمی ہے اور اسے مزید کمزور ہونا چاہیے۔"

ابو مخنف کے مطابق، اس کے بعد عمر سعد نے بھی ایسا ہی خط لکھا تھا۔ جب یزید کو اس قسم کے خطوط پہنچے تو اپنے ایک غلام کو جس کا نام سرحون تھا، بلایا اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ کیا امیر المومنین یزید کو مشورے کے لیے سرحون سے بہتر کوئی اور مشیر نہیں ملا تھا، کیا دمشق میں سارے ناتجربہ کار اور سیاست سے نابلد لوگ رہتے تھے اور کیا آقا اور غلام کی اس راز و نیاز کی باتیں سننے کے لیے ابو مخنف ٹائم مشین پر بیٹھ کر وہاں پہنچ گیا تھا؟

عبید اللہ بن زیاد کا تقرر

اغلب ہے کہ یزید نے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ کیا ہو گا اور بڑھتی ہوئی باغیانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اس نے نعمان کی جگہ امیر بصرہ عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کی حالت درست کے لیے معمور و متعین کر دیا۔ واضح رہے کہ یزید نے بصرہ کی حکومت کے ساتھ کوفہ کی تولیت بھی ابن زیادہ کو عارضی طور پر سپرد کی تھی۔

ابو مخنف نے ابن زیاد کے نام یزید کا جو خط اپنے مقتل میں درج کیا ہے، وہ کافی دلچسپ ہے:

"یزید ابن معاویہ کی جانب سے عبید اللہ ابن زیاد کے نام۔ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ کوفہ کے لوگوں نے حسین کی بیعت کرلی ہے۔ تم کو پہلے بھی ایک خط لکھ چکا ہوں کہ کوئی ایسا تیر دشمن کی طرف پھینکو۔ تجھ سے تیز تر میرے پاس کوئی نہیں۔ میرا خط ملتے ہی فوراً بغیر سستی کے سفر پر روانہ ہو جاؤ اور نسل علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے ایک نفر کو بھی زندہ نہ چھوڑو۔ مسلم بن عقیل کو قتل کر کے اس کا سر مجھے روانہ کرو۔ والسلام۔"

اگر واقعی ایسا خط یزید نے بھیجا تھا تو خود اس وقت اس پر عمل کیوں نہیں کیا، جب آل علی قیدی بن کر اس کے دربار میں پیش ہوئے تو ان سب کو قتل کر دیتا؟ خود ابن زیاد نے بھی واقعہ کربلا کے بعد ان سب کو قتل کیوں نہیں کیا؟

کیوں آل بیت یزید کی حمایت پر قائم رہے اور اس کے خلاف ہر شورش سے بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کیا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے؟ کیوں آل علی اور تمام بنو ہاشم نے ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا اور اس حادثے کے بعد بھی باہمی رشتے ناطے ہوتے رہے؟ بعد میں جب ابن زبیر نے طاقت پکڑی تو بنو ہاشم موقع غنیمت سمجھ کر ان کے ساتھ کیوں نہ ہوئے؟ جب خون حسین کا انتقام لینے کے لیے اول التوابون کھڑے ہوئے اور ان کے بعد مختار ثقفی کھڑا ہوا تو بنو ہاشم نے اپنے خاندان کا انتقام لینے کے لیے اس تحریک کی سرپرستی کیوں نہ کی؟ ایسے بہت سارے سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں جن سے یزید کا یہ فرمان سرے سے مشکوک ہو جاتا ہے۔

قصہ مختصر، ابن زیاد نے کوفہ پہنچ کر لوگوں کو مسجد میں اکٹھے ہونے کا حکم سنایا۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ اس نے منبر پر چڑھ کر تقریر کی:

"اے لوگو! مجھے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا، میں اسے اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ میں عبید اللہ بن زیاد ہوں۔ یزید نے مجھے تمھارے شہر کا حاکم بنایا ہے۔ مجھے اختیار دیا ہے کہ میں مظلوم کے ساتھ انصاف کروں۔ محروم کو اس کا حق دلاؤں اور قصوروار لوگوں سے مہربانی سے پیش آؤں۔ لہذا میں تمھارے ساتھ یزید کی ان ہدایات کا پابند ہوں۔"

ابو مخنف آگے کہتا ہے کہ اس کے بعد وہ منبر سے اتر آیا اور یہ عام منادی تمام قبائل عرب میں کرادی کہ لوگ یزید کی بیعت اختیار کرلیں، پیشتر اس کے کہ شام سے کوئی ایسا شخص ان کے پاس جو مردوں کو قتل کرے اور خواتین کو قید کرے۔ جوں ہی کوفہ کے لوگوں نے یہ منادی سنی تو ایک دوسرے کا منہ تکنے اور یہ کہنے لگے؛ "ہم اپنے تیئں دو بادشاہوں کے درمیان کیوں پھنسیں۔" لہذا انھوں نے حسین کی بیعت توڑ کر یزید کی بیعت کرلی۔

لیجیے صاحب، ایک طرف تو راوی کا دعویٰ یہ ہے کہ 80،000 لوگوں نے حکومت سے بے تعلق اور بیزار ہو کر حسین سے بیعت کرلی، دوسری طرف یہ بھی کہہ رہا ہے کہ ابن زیاد کے صرف ایک حکم اور دھمکی پر حسین کی بیعت توڑ کر دوبارہ یزید سے بیعت کرلی۔ حیرت ہی حیرت ہے اس دیومالائی قصے میں، چلیے آگے بڑھتے ہیں۔

ہانی بن عروہ کے گھر

مسلم بن عقیل کو جب یہ خبر ملی تو بقول ابو مخنف، انھوں نے افسوس کے انداز میں اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور گلی کوچوں میں سے ہوتے ہوئے محلہ بنی خزیمہ میں پہنچے۔ وہاں کے ایک بلند گھر کے کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اس گھر سے ایک کنیز نکلی۔ مسلم نے پوچھا کہ یہ کس کا گھر ہے؟ جواب ملا، ہانی بن عروہ کا۔ آپ نے کنیز سے فرمایا کہ تو اندر جا اور کہہ کہ ایک شخص دروازے پر کھڑا ہے۔ اگر میرا نام پوچھیں تو کہنا مسلم بن عقیل ہیں۔ کنیز واپس آ کر کہنے لگی، اے میرے آقا! گھر کے اندر تشریف لے آئیں۔ ہانی اس روز بیمار تھے۔ جب مسلم تشریف لائے تو کھڑے ہونا چاہا تا کہ ان سے گلے مل لیں مگر (ناتوانی کی وجہ سے) نہ مل سکے۔

ایک بار پھر حیرت ہوتی ہے کہ مسلم بن عقیل جیسا معزز مہمان جو حسین کا قاصد ہی نہیں، ان کا بھائی بھی ہے، جس کے آتے ہی شیعان علی و حسین کی سرگرم آمد و رفت اس کے پاس شروع ہو گئی تھی اور بقول ابو مخنف 80،000 لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، وہ ابن زیادہ کی ایک دھمکی سن کر جب اپنا قیام تبدیل کرنا چاہتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی ایک آدمی بھی، جی ہاں اس 80،000 میں سے صرف ایک مقامی آدمی بھی ان کی غم خواری یا مدد کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایک غریب الدیار بے یار و مددگار شخص جدھر منھ اٹھائے، اُدھر چل دیتا ہے اور ایک اجنبی کے گھر کے باہر کونے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دوسری حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سنگین صورت حال میں مسلم کو پہلے یہ چاہیے تھا کہ وہ حسین کو یہاں کی موجودہ صورت حال کے بارے میں بتا دیتے، کیوں کہ وہ اس سے پہلے اپنے اطمینان کا خط حسین کو بھیج چکے تھے اور ان کے کوفہ آنے کے لیے ہری جھنڈی دکھا چکے تھے کہ یہاں فوراً آ جائیے، یہاں حالات ساز گار ہیں۔ لہٰذا اس بدلی ہوئی صورت حال کی خبر دینے کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم کو کوئی جلدی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ ہانی کے گھر میں پناہ لینے کے باوجود بھی وہ اس بارے میں بجائے حسین کو فوراً اس بارے میں خبر کرنے کی کوئی ترکیب نکالتے، انھوں نے تو ہانی کے ساتھ مل کر ابن زیاد کو قتل کرنے کی اسکیم بنانی شروع کر دی۔

ابن زیاد کے قتل کی سازش

ابو مخنف بیان کرتا ہے کہ ہانی نے کہا؛"اے میرے آقا! وہ (ابن زیاد) میرے دوستوں میں سے ہے۔ میری بیماری کا سن کر شاید وہ میری عیادت کے لیے آئے۔ جب وہ آئے تو یہ تلوار ہاتھ میں لے کر اس کوٹھری میں چلے جانا۔ جب وہ آکر بیٹھ جائے تو اسے قتل کر دینا، اسے ذرا بھی مہلت نہ دینا۔ اگر وہ آپ کے ہاتھ سے بچ نکلا تو مجھے اور آپ کو قتل کر دے گا۔ میں اور آپ یہ نشانی رکھتے ہیں کہ جب میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر زمین پر رکھ دوں تو آپ اس پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔"

مسلم نے کہا؛"انشا اللہ یہ کام میں کر لوں گا۔"

غرضیکہ ہانی عروہ کی دعوت پر ابن زیادہ نماز عشا کے بعد اپنے محافظوں کے ہمراہ ہانی کے گھر عیادت کے لیے پہنچا۔ ہانی کو بتایا گیا کہ ابن زیاد دروازے پر اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ہانی نے اپنی کنیز سے کہا کہ تلوار مسلم کو دے دو۔ مسلم تلوار لے کر کوٹھری میں چلے گئے۔ ابن زیاد آکر ہانی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا محافظ سرہانے کھڑا تھا۔ ابن زیاد، ہانی سے باتوں میں مشغول ہو گیا اور احوال پرسی کرنے لگا۔ ہانی نے بھی اپنے مرض کا حال بتایا۔ اس وقت اس نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر زمین پر رکھا لیکن مسلم کوٹھری سے باہر نہ آئے۔ دوبارہ اور پھر تیسری بار عمامہ سر پر رکھ کر زمین پر رکھا لیکن مسلم کوٹھری سے باہر نہ آئے۔ ہانی سے سر اونچا کر کے اس انداز میں جیسے مسلم کو سنا رہے ہیں، یہ اشعار پڑھے:

"تم سلمیٰ کے بارے میں منتظر ہو کر بھی اسے سلام نہیں کرتے۔ سلمیٰ کو سلام کرو اور اس کے ہر ساتھی کو بھی۔ آیا شربت خوش ذائقہ نہیں جو کہ پیاس کے بجھانے کے لیے پیتا ہوں۔ اگرچہ وہ مجھے جان سے مار ڈالے۔ اگر سلمیٰ کو تمھارے بارے میں ذرا شک بھی ہو گیا تو ہرگز تم اس کے وار سے محفوظ نہ رہو گے۔"

ہانی یہ اشعار بار بار دہراتے رہے لیکن ابن زیاد نے کوئی توجہ نہیں کی، البتہ یہ پوچھا کہ ہانی ہذیان کیوں بک رہا ہے؟ لوگوں نے کہا، بیماری کی شدت کی وجہ سے۔ اس کے بعد ابن زیاد وہاں سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر واپس چلا گیا۔

جب مسلم باہر آئے تو ہانی نے کہا؛ آپ نے کس وجہ سے اسے قتل نہ کیا؟

مسلم نے فرمایا کہ پیغمبر خدا کی روایت جو میں نے سنی ہوئی تھی کہ کسی مسلمان کو قتل کرنے سے ایمان ضائع ہو جاتا ہے۔ ہانی نے کہا کہ اگر آپ اسے قتل کر دیتے تو ایک کافر کو مارتے۔

مسلم کا یہ عذر لنگ سمجھ نہیں پایا کہ مسلمان کو قتل کرنے سے ایمان ضائع ہو جاتا ہے، حالاں کہ ان کے چچا علی ابن طالب کے ہاتھ جنگ جمل اور صفین میں ہزاروں مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے، پھر کیا مسلم کو پیغمبر کی وہ روایت یاد نہیں آئی کہ خلیفہ وقت کے خلاف سازش کرنے والے کی گردن اڑادی جائے؟

ابن زیاد کی عملی کاروائی

عبید اللہ بن زیاد جوان، چست، چالاک اور سخت گیر منتظم تھا۔ اس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ داروں کو حکم دیا کہ کسی کے یہاں کوئی پردیسی ٹھہرا ہوا ہو، کوئی باغی ہو یا اشتہاری مجرم تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے۔ جو کوئی ایسا کرے گا، وہ ان لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہو گا، لیکن جو ایسا نہ کرے گا، وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری دے کہ اس کے حلقے اور اس کی جماعت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہو گی اور جو کوئی ایسا نہ کرے گا اس سے ہم بری الذمہ ہوں گے، اس کا مال اور اس کی جان حلال ہو گی۔ اس سرکاری آرڈر کے مطابق، جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیر المومنین کی حکومت کا کوئی ایسا قانونی مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی گئی، تو اس عریف کو دروازے پر ہی اسے پھانسی دے دی جائے گی، اس کے حلقے کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا اور عریف کو شہر بدری کی سزا دی جائے گی۔ (تاریخ طبری، جلد6، صفحہ 201)

ابن زیاد نے وہی کیا جو ایک قابل منتظم کو کرنا چاہیے، خانہ جنگی اور باغیانہ سازشوں کی روک تھام کے لیے اس دور جدید میں بھی یہی کیا جاتا ہے، اور یہ ابن زیادہ کا اپنے منصب اور اپنی حکومت سے وفاداری کا ثبوت تھا۔ اس نے ایک کام اور کیا جس کے لیے اس کا تقرر کوفہ میں کیا گیا تھا۔ ابو مخنف کے مطابق، ابن زیاد نے اپنے ایک چالاک اور ذہین غلام جس کا نام معقل تھا، اسے تین ہزار درہم دے کر کہا کہ مسلم بن عقیل کا پتہ چلا اور انھیں دے کر کہنا کہ یہ اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے اپنے مصرف میں لائیں، پھر ان کا ٹھکانہ مجھے آکر بتانا۔ معقل اپنے کام میں جُٹ گیا

اور مسلم بن عوسجہ کو بہلا پھسلا کر اس نے مسلم بن عقیل کا پتہ لگالیا جو اس وقت ہانی کی پناہ میں تھے۔ وہ مسلم سے ملا اور انھیں بھی قسمیں دے دے کر یقین دلایا، بالآخر مسلم نے اس پر بھروسہ کر کے اس سے بیعت لے لی۔ مسلم نے معقل کا دیے ہوئے تین ہزار درہم ابا تمامہ کو دے دی جو آپ کا خزانچی مقرر تھا اور اسلحہ کی خریداری کا کام بھی اسی کے ذمہ تھا۔ خزانچی کا تقرر، درہم جمع کرنا، اسلحہ خریدنا اور لوگوں سے بیعت لینا، یہ ساری کاروائی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے سیاسی اقتدار حاصل کرنے ہی کے لیے تو کی جارہی تھی، نہ کہ حق و باطل کے جنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔

ہانی بن عروہ سے بازپرس اور قتل

بہر حال، معقل اپنا کام کر چکا تھا، اس نے ابن زیاد کو مسلم بن عقیل کا ٹھکانہ بھی بتادیا اور ان کے باغیانہ ارادے کی توثیق بھی کر دی۔ ظاہر ہے کہ ابن زیاد کو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو حکومت وقت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، وہ ان کے اپنے دوست ہانی کے گھر میں مقیم ہیں اور اس کے اپنے دوست کا گھر خود اس کے اور حکومت وقت کے خلاف خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس نے ہانی کو بلوایا تو ابن زیاد نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ہانی نے انکار کرنا چاہا لیکن معقل کو سامنے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ابن زیاد نے پھر بھی اس سے رعایت کی اور اس سے کہا کہ وہ مسلم بن عقیل کو یہاں لے کر آئیں اور خود چلے جائیں۔ لیکن ہانی کو اپنا مہمان اور پناہ گیر کا حق یاد آگیا، جب کہ اسے اپنے محسن اور دوست ابن زیادہ کا حق اس وقت یاد نہ رہا تھا جب وہ مسلم کے ساتھ اس کو قتل کرنے کی سازش رچ رہا تھا۔

ہانی کے انکار سے بات ترش کلامی تک جا پہنچی، حتیٰ کہ بقول ابو مخنف، ابن زیاد نے اس کو بید مارا، جواب میں ہانی نے اپنی تلوار سونت لی اور ابن زیاد پر چلائی، جس سے وہ زخمی ہو گیا۔ ہانی نے معقل کو بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ ظاہر ہے گورنر ہاؤس میں گورنر اور اس کے معاون پر حملہ بولنے کا جو انجام ہونا تھا، وہی ہوا۔ ہانی کے سر پر ایک آہنی گرز مارا گیا اور اسے ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ جب ہانی کے اس انجام کی خبر قبیلہ مذحج تک پہنچی تو عمرو بن الحجاج دیناری 400 سواروں کو لے کر گورنر ہاؤس کو گھیر لیا۔ ابن زیاد نے جب یہ بات سنی تو قاضی شریح سے کہا کہ آپ ان کے پاس جایئے اور بتایئے کہ ان کا آدمی زندہ ہے اور میں نے کچھ خاص معاملات ان کے سپرد کیے ہیں اور باہم ایک دوسرے گفت و شنید میں مصروف ہیں۔ قاضی شریح جو کبھی علی ابن طالب کے قاضی تھے اور بعد میں بھی محکمہ قضا سے متعلق رہے، وہ باہر نکلے اور وہی دہرادیا جو ابن زیاد نے کہنے کے لیے کہا تھا۔ قبیلہ مذحج کے لوگ مطمئن ہو کر لوٹ گئے۔

مسلم بن عقیل کی دربدری

اُدھر مسلم بن عقیل نے جب ہانی کے متعلق سنا تو وہ اس کے گھر سے جلدی سے نکل پڑے اور راستہ ناپتے ہوئے کوفہ سے باہر نکل گئے، حتیٰ کہ حیرہ پہنچ گئے۔ وہاں گھومتے گھومتے ایک مکان پر پہنچے، انھوں نے ڈیوڑھی پر بیٹھی ایک خاتون کو اپنا تعارف دیا اور پناہ دینے کی التجا کی۔ اس شریف خاتون نے مسلم کو پناہ دے دی، لیکن اس کا بیٹا جو ابن زیاد کی فوج کا افسر تھا، اسے بھنک لگ گئی کہ حکومت وقت کا باغی اسی کے گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو اپنے ارادے سے لاعلم رکھا کہ وہ کہیں مسلم کو راتوں رات بھگا نہ دے، لہٰذا صبح ہوتے ہی اس نے ابن زیادہ کو پورا ماجرا سنا دیا۔ ابن زیاد نے فوراً پانچ سو سواروں کے ساتھ اس کی کمان محمد بن اشعث کو سونپی۔ یہ صاحب بھی مسلم بن عقیل کے گھرانے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان کے والد اشعث بن قیس، علی کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے لیکن جنگ صفین کی خونریزی دیکھ کر علی کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک برگشتگی آئی، اس میں یہ بہت نمایاں ہوئے۔

مسلم بن عقیل کی داد شجاعت اور گرفتاری

جب گھوڑوں کی ٹاپیں، لگاموں کی ٹخ ٹخ اور پیدل فوج کا شور مسلم کی پناہ گاہ کے پاس پہنچا تو وہ سمجھ گئے کہ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی، انھوں نے کمر کسی، زرہ پہنی اور تلوار لہراتے ہوئے باہر نکلے۔ ابو مخنف نے اس پورے منظر نامے کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کے فلم ساز بھی پسینے پسینے ہو جائیں۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ پھر مسلم دروازے کی طرف بڑھے اور اسے اکھاڑ پھینکا، حالاں کہ وہ بڑا مضبوط اور دبیز تھا۔ دروازہ اکھاڑنے کی ضرورت کیوں

لاحق ہوئی؟ کیا کوئی انھیں باہر جانے سے روک رہا تھا؟ لیکن علی کے بھتیجے تھے، جن کے حوالے سے خیبر کی لڑائی میں ایک قلعے کے پھاٹک کو اکھاڑ ڈالنے کی روایت مشہور تھی، ظاہر ہے اس کرامت کا اعادہ ضروری تھا، سو بھتیجے سے بھی راوی نے دروازہ اکھڑوا دیا۔

پھر ابو مخنف کے اس "ریمبو" (Rambo) نے چشم زدن میں 180 سوار مار گرائے، باقی لوگ بھاگ گئے۔ پھر ابن اشعث نے پانچ سو سوار مزید منگوائے، لیکن توبہ کیجیے کہ ابو مخنف کا ہیرو اتنی جلدی بھلا زیر کیوں کر ہوتا، اس نے کشتے کے پشتے لگا دیے، حتیٰ کہ اشعث کو اور 500 سوار منگوانے پڑے۔ واضح رہے کہ یہ جو گاجر مولی کی طرح لوگ کٹتے چلے گئے تھے، یہ وہ تھے جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے لیکن ایک تنہا آدمی نے انھیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ظاہر ہے عجائب پرستی اور دیومالائی انداز تو قائم رکھنا ہی تھا، ورنہ کہانی میں زور کہاں سے پیدا ہوتا، پھر تو حقیقت تو بس اتنی ہی رہ جاتی کہ مسلم کو گرفتار کر لیا گیا اور بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا لیکن اس میں وہ مزہ کہاں؟ پھر آنے والے عہد میں مرثیہ خوانوں اور ذاکرین کے پیٹ بھی تو بھرنے تھے جو لہک لہک کر مسلم کی داد شجاعت کو سنا کر مسلمانوں میں احساس تفاخر پیدا کریں اور حق کو باطل سے زیادہ شجاع قرار دیں۔ یہ تو کچھ نہیں، اصلی ڈرامہ اس وقت شروع ہو گا جب حسین اپنے عیال اور خیر خواہوں کے ساتھ میدان کربلا میں دشمنوں کے ساتھ داد شجاعت دے رہے ہوں گے، یقین مانیے آپ کا منھ کھلا کا کھلا رہ جائے گا، چونکہ اس وقت آپ ایک بہترین قسم کی war movie دیکھ رہے ہوں گے۔

بہر حال، چونکہ راوی مسلم بن عقیل کو بآسانی گرفتار ہونے دینا چاہتا نہیں تھا، چنانچہ اس نے انھیں دھوکے سے گرفتار کرا دیا، اس سے بیک وقت کئی فائدے ہوئے؛ ایک تو مسلم بن عقیل کو گرفتار بھی دکھا دیا، دوسرے یہ کہ مسلم کی شجاعت کی لاج بھی رکھ لی، تیسرے یہ کہ دشمنوں کی مکاری دکھا کر مسلم کے لیے قارئین سے ہمدردی بھی سمیٹ لی۔

مسلم بن عقیل کا انجام

بہر حال، مسلم بن عقیل کو گرفتار کرکے ابن زیاد کو پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے مسلم کو اپنی موت سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی، لہٰذا انھوں نے سلام وغیرہ کرنا تو درکنار واہی تباہی بکنی شروع کردی، ابن زیاد جواب میں ہنستا رہا۔ آخر میں اس نے کہا، "تم سلام کرو یا نہ کرو، قتل بہر حال آج ہی کردیے جاؤ گے۔" مسلم نے یہ سن کر کسی قریشی شخص کو طلب کیا تا کہ وہ آخری وصیت کر سکیں۔ اس پر عمر بن سعد کھڑا ہوا جسے مسلم نے وصیت کرتے ہوئے کہا:

"میری پہلی وصیت تو یہ گواہی ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں، وہ یکتا و لاشریک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور یہ کہ علی ولی اللہ ہیں یعنی اللہ کے دوست ہیں۔" (جو کلمہ شہادت تیسری صدی میں شیعوں نے ایجاد کیا، اسے راوی مسلم کے منھ سے کہلوا رہا ہے، سبحان اللہ۔)

"دوسری وصیت یہ ہے کہ میری زرہ بیچ کر ایک ہزار درہم ادا کر دینا جو میں نے تمھارے شہر میں قرض لیے ہیں اور تیسری وصیت یہ ہے کہ میرے سردار حسین کو لکھ دینا کہ واپس ہو جائیں (موت کے منھ میں پہنچ کر اب حسین کا خیال آیا)۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ روانہ ہو چکے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کا انجام بھی وہی نہ ہو جو میرا ہوا ہے۔"

عمر بن سعد نے کہا، "جس گواہی کا ذکر تم نے کیا، تو یہ گواہی تو ہم سب بھی دیتے ہیں (یعنی 3 ہجری کو جو کلمہ ایجاد ہوا، اسے امیر سعد اور مسلم دونوں پہلے سے ادا کر رہے ہیں، یہاں یہ جتانا مقصد ہے لیکن وائے حیرت کہ امیر ابن سعد اس کلمہ شہادت کو پڑھنے کے باوجود یزید بن معاویہ کے ہاتھوں پر بیعت ہی نہ تھا بلکہ اس کا عمال مقرر تھا)، اور تم اپنی زرہ بیچنے اور قرض ادا کرنے کی جو بات کی ہے تو ہمارا اختیار ہے، چاہیں تو ادا کریں اور نہیں چاہیں گے تو نہیں کریں گے۔ رہے حسین تو ان کا ہمارے پاس آنا لازمی ہے تا کہ ہم انھیں رہ رہ کر موت کا مزہ چکھائیں۔"

آپ جانتے ہیں کہ راوی کس عمر بن سعد کی بات کر رہا ہے؟ جی، یہ امیر ابن سعد رسول اللہ کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ کون سعد؟ سعد، حمزہ سید الشہدا کے سگے ماموں تھے اور آمنہ کے چچا کے بیٹے۔ رسول اللہ انھیں سگے ماموں کی طرح مانتے تھے، صحابہ انھیں خال رسول اللہ کہا کرتے تھے۔ ان رشتوں کی موجودگی میں عمر بن سعد کا نواسہ

رسول سے لڑنے اور ان کا سر کاٹ کر لانے کے لیے کیسے تیار ہو سکتے ہیں، منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن ایک منطق دی گئی ہے جس پر ہم حسین کے کربلا پہنچنے پر بات کریں گے۔

ابو مخنف آگے بتاتا ہے کہ ابن زیاد نے حکم دیا کہ مسلم کو محل کی چھت پر لے جا کر اوندھے منھ گرا دیا جائے۔ جب انھیں چھت پر لے گئے تو مسلم نے کہا؛ "مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو، اس کے بعد تمھارا جو جی چاہے کرنا۔"

ملازم نے کہا، اس کا کوئی امکان نہیں۔ اس پر مسلم رونے لگے اور پورے پانچ اشعار پڑھے جس میں اپنے خاندان کی برتری، اپنے مخالفین کو کوسنے اور بد دعاؤں کی جھڑی لگا دی گئی تھی۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر مسلم نماز نہیں پڑھ سکے تو اتنی دیر میں شعر کہنے کی بجائے اللہ کا ذکر کیوں نہ کیا؟ لیکن راوی کو تو شعر کہنے تھے جس میں وصی نسب کا ذکر عالیہ ہو۔

یزید کو اطلاع اور اس کا ردعمل

بہر حال، مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کرنے اور سازشیں کرنے کے جرم میں قتل کر دیے گئے۔ جب ہانی اور مسلم قتل کر دیے گئے تو ابو مخنف کے مطابق ان دونوں کے سر یزید کے پاس بھیج دیے گئے۔ یزید نے جو خط ابن زیاد کو لکھا، وہ بھی پڑھ لیجیے:

"اما بعد، یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ تم مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو۔ اپنی جان کی قسم تم نے واقعی خیر خواہی کی اور بھرپور کام کیا، تم نے حق ادا کر دیا اور شیر کی طرح بہادری دکھا دی۔" (سبحان اللہ، ایک شخص کو مارنا شیر کی طرح بہادری ہی تو ہے۔)

یزید کی جانب سے پیش کردہ خط کے اگلے سطور یوں ہیں؛ "میں نے تمھارے دونوں قاصدوں کو بلا کر وہ تفصیل معلوم کی، جو تم نے بیان کی ہے اور اسے ویسا ہی پایا ہے جیسا تم نے لکھا ہے۔ ان کے بارے میں، میں تمھیں

بھلائی کی وصیت کرتا ہوں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسین عراق کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ تم سب طرف نگہبان مقرر کر دو اور روزانہ مجھے ان کے بارے میں اطلاع دیتے رہو۔"

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ تیز سے تیز سواری میں آدمی کوفہ سے دمشق بیس دن میں پہنچتا، پھر روزانہ اطلاع دینے کی صورت کیسے نکلتی؟ اگر روز ایک آدمی روانہ ہوتا تو اس کی پہنچائی ہوئی خبر تین ہفتے پرانی ہوتی۔ دوسری غور طلب بات یہاں یہ ہے کہ ابن زیاد کو یزید کا معتمد خاص بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف اس کا اتنا بھی اعتبار نہیں کہ جب تک وہ کسی مقتول کا سر اس کے پاس نہ بھیجے، اس کی بات قبول نہیں کی جا سکتی۔ مسلم کا قتل کون سا بڑا کارنامہ تھا جس پر ستائش کے یہ ڈونگرے برسائے جا رہے تھے؟ مسلم کی جنگ اور ان کی گرفتاری ایک سادہ معاملہ تھا۔ پھر خود ابو مخنف ہی یہ کہتا ہے کہ چونکہ ایک بااختیار امیر نے آئین کے تحت یہ اقدام کیا تھا، اس لیے اہل کوفہ نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور ان کی لاشیں حکومت سے حاصل کر کے دفن کر دی گئیں۔ جب شہر کی صورت حال ایسی پُر امن تھی تو نہ ان کا سر کاٹنے کی کوئی ضرورت تھی اور نہ ان کی لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹنے کی (جیسا کہ روایات میں درج ہیں)۔ یہ سارا افسانہ محض جذبات کو برانگیخت کرنے کے لیے گڑھا گیا ہے، جس کی تاریخی اعتبار سے کوئی قیمت نہیں ہے۔

مسلم بن عقیل کے بچے؟

اب آپ پوچھیں گے کہ مسلم بن عقیل کے ان دونوں بچوں یعنی محمد اور ابراہیم کا آپ نے کوئی ذکر نہیں کیا جن کی معصومیت اور جن کے قتل پر ہمارے مرثیہ خواں آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں، مائیں پچھاڑیں کھاتی ہیں، صاحب اولاد ہچکیاں لے لے کر اپنے سر دیواروں پر مارتے ہیں۔ مجھے نہایت ہی افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ واقعہ کربلا کے اس قدیمی اور اولین راوی ابو مخنف کے ہاں ان بچوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ بچے مرثیہ خوانوں کے پیدا کردہ ہیں جن سے یہ مجلسوں میں قتل کر کے ان کے نام کی کمائی کھاتے ہیں۔

حسین کوفہ کی جانب

ابو مخنف کہتا ہے کہ جب مسلم اور ہانی شہید کیے جا چکے اور حسین کو ان کی کوئی خبر نہ ملی تو انھیں سخت پریشانی ہوئی۔ حسین نے اپنے اہل خانہ کو جمع کیا اور مدینہ واپسی کا حکم دیا۔ لہٰذا سب لوگ مدینہ واپس آ گئے۔

مکہ سے کوفہ

جملہ مورخین اور جغرافیہ کے ٹھوس حقائق سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حسین مکہ سے پھر کبھی لوٹ کر مدینہ نہیں گئے بلکہ مکہ ہی میں چار مہینے قیام کر کے یہیں سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ لیکن چونکہ ابو مخنف کو سفر کا آغاز بھی ڈرامائی بنانا تھا، سو اس نے حسین کو مدینہ بھیجا جہاں وہ مرقد رسول سے لپٹ کر اس شدت سے روئے کہ آپ پر غنودگی طاری ہو گئی اور رسول اللہ کو اسی غنودگی میں یہ فرماتے سنا: "فوراً فوراً، جلدی جلدی بھاگ کر ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تمھاری آمد کے مشتاق ہیں۔"

حسین کے آغاز سفر کی صحیح تاریخ 10 ذی الحجہ 60 ہجری ہے، جو کئی راویوں اور محققین سے ثابت ہے۔ ابو مخنف نے اس کے برخلاف روانگی کی تاریخ 8 ذی الحجہ (یوم ترویہ) بتائی ہے اور اس کی تصدیق اس نے حسین سے منسوب ایک مکتوب کے آخری فقرے سے کرانے کی کوشش کی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حسین نے دوران سفر اہلیان کوفہ کو اپنی آمد کی اطلاع کے طور پر ارسال کیا تھا۔ محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" میں تاریخ کے اس تنازعہ پر بحث کی ہے کہ حسین کے قافلے کا سفر 8 ذی الحجہ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا 10 کو؟ عباسی کے مطابق 8 کی جو روایت عام طور پر مورخین کے ہاں پائی جاتی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ صحیح تاریخ 10 ذی

الحجہ ہے۔ مجھے ذاتی طور پر 8 یا 10 ذی الحجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی واقعہ کربلا پر ان تاریخوں سے کوئی فرق پڑتا ہے، لہٰذا ہم اس سے اغماض نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

خیر خواہوں کی آخری کوشش

خیر خواہوں نے ایک بار پھر حسین کو روکنے کی کوشش کی جن میں اہم نام عبد اللہ بن عباس، محمد بن حنفیہ، عبد اللہ بن مطیع اور عبد اللہ بن عمر کا نام بھی شامل ہے۔ اس طرح اور کئی نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے زمرے میں تھا، ابن کثیر نے ایک ہی جگہ یہ نام اور اقوال جمع کر دیے ہیں (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 163)۔ ہر ایک نے کوفہ کے ارادے سے باز رہنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی لیکن حسین اپنے موقف پر قائم رہے، ان پر کسی کا مشورہ یا کسی کی خیر خواہی نے کوئی اثر نہ دکھایا۔

حسین کے عم زاد عبد اللہ بن جعفر جو حجاز کی بڑی اہم شخصیت تھے اور عم زاد ہونے کے علاوہ حسین کی ہمشیرہ زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے، انھیں جب خبر ملی کہ حسین کوفہ کی سمت روانہ ہو گئے ہیں تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ وہ انھیں روک سکیں اور خود والی حرمین عمرو بن سعید کے پاس جا کر ان سے ایک خط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ حسین لوٹ آئیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آیا جائے گا اور ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ ہو گی۔ لیکن تمام لوگوں کی طرح حسین کے ارادے کو بدلنے میں وہ بھی ناکام رہے (طبری، جلد 6، صفحہ 219-220)۔

طبری میں ہی ایک اور روایت اس کے بالکل متضاد ملتی ہے، ملاحظہ فرمائیں؛

"جیسے ہی قافلہ مکہ سے نکلا، حاکم مکہ عمرو بن سعید کے فرستادے ان کے بھائی یحییٰ بن سعید کی قیادت میں ان کا راستہ روکنے اور بہ جبر مکہ واپس لانے کے لیے پہنچے مگر یہ لوگ کامیاب نہ ہو سکے، تھوڑی سی زور آمائی اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے نامراد لوٹنے پر مجبور ہوئے (طبری، جلد 6، صفحہ 217-218)۔

ظاہر ہے دونوں روایات کے درمیان تضاد کی اتنی بڑی کھائی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ہی درست ہو سکتی ہے۔ دوسری روایت اس لیے حلق کے نیچے اترتی، کیوں کہ تقریباً سوا چار مہینے حسین سے کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ

آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، حالاں کہ کوفہ سے وفود آتے جاتے رہے، خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، سفر کی تیاریاں ہوتی رہیں، اور سب سے بڑی بات کہ حکام کو یہ بھی پتہ تھا کہ انھوں نے مدینہ کیوں چھوڑا تھا۔ ابن زبیر جو حسین کے ساتھ ہی مدینہ سے مکہ آئے تھے، حکام نے ان کی گرفتاری کی کاروائی فوراً شروع کر دی تھی لیکن حسین کو کچھ نہ کہا گیا۔ تقریباً 80-90 لوگوں کا قافلہ جانے کو تھا جس کی تیاریاں ظاہر ہے دو چار دن پہلے سے تو بالکل صاف نظر آنے لگی ہوں گی لیکن حاکم مکہ ان سے تعرض نہیں کرتا، البتہ جب وہ مکہ سے نکل جاتے ہیں تو ان کو پکڑنے کو اپنے آدمی دوڑاتا ہے، کیا اس کی کوئی تک بنتی ہے؟

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے، وہ علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی وطن تھا۔ طبری نے دوران سفر حسین سے اس کی ملاقات بتانے والی دو روایتیں دی ہیں، جن میں سے ایک بتاتی ہے کہ مقام صفاح پر اس کی ملاقات ہوئی جو کہ حدود حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے۔ اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوفی ہیں جو یوم ترویہ میں مکہ مکرمہ پہنچے جو حسین کی روانگی کا دن تھا اور آپ کو رخصت کر کے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روایتیں انھی دو کے حوالے سے ہیں (طبری، جلد 6، صفحہ 218)۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر شتابی سے حسین کے تعاقب میں نکلے، شریک سفر ہونے کے لیے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم "صفاح" پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق، حسین سے مل رہا ہے۔ دونوں کے درمیان بات چیت ختم ہوئی تو حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی۔ گویا فرزدق عراق کی طرف سے آ رہا تھا، جس طرف حسین جا رہے تھے۔ عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا، جب کہ حج ہو چکا تھا؟ دوسری بات یہ کہ صفاح تک پہنچتے پہنچتے جو بمشکل دس میل پر ہے، ایسے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوفی (عبد اللہ بن سلیم اور المذری بن مشعل) حج کرنے کے بعد حسین کے پیچھے نکلے تو اس وقت تک حسین کا قافلہ صفاح تک ہی پہنچا تھا؟ حالاں کہ یہ دونوں حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد 12 ذی الحجہ سے پہلے روانہ نہیں ہو سکے ہوں گے، یعنی حسین کی روانگی کے چار دن بعد ان کی روانگی ہوئی ہو گی لیکن وائے حیرت کہ ان چار دنوں میں حسین کا قافلہ دس میل تک ہی پہنچ پایا جب کہ دونوں راوی فوراً اس جگہ پہنچ گئے؟

طبری کی دوسری روایت میں راوی خود فرزدق ہے۔ اس روایت کے مطابق فرزدق 60ھ کے ایام حج میں (اپنی والدہ کو حج کرانے کے لیے) حرم یعنی حدود حرم میں داخل ہوا تو اسے ایک قافلہ مکہ سے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ حسین بن علی کا قافلہ ہے۔ فرزدق نے لپک کر دعا سلام اور کچھ بات چیت کی جس میں یہ سوال بھی شامل تھا کہ اے ابن رسول اللہ، آپ حج چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں؟ (ایضاً)

ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے اپنے ماخذ سے لی ہے (عبد الرزاق الموسوی المقرم، "مقتل الحسین"، صفحہ 175)۔ یہ روایت اس ملاقات کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کرکے لوٹ رہا تھا، تب اس کی حسین سے ایک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی۔ غرض "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کے مصداق جتنے منھ اتنی باتیں۔

فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں بتاتی ہیں کہ حسین نے فرزدق سے پوچھا، "اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آرہے ہو؟ فرزدق نے جواب دیا کہ "دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنو امیہ کے ساتھ اور قضا و قدر اللہ کے ہاتھ میں۔ جس پر آپ نے فرمایا؛ سچ کہتے ہو۔ اور پھر رخصت ہوگئے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 218)

یہاں آپ کو میری طرح حیرت زدہ ہوجانا چاہیے کہ حسین نے تو پورے اطمینان کے ساتھ اس سفر کو شروع کیا کہ کوفہ کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کے چشم براہ ہیں اور اب تک انھیں مسلم بن عقیل کے انجام کی خبر نہ تھی، پھر فرزدق کی اس مختلف بات پر اظہار تعجب کی بجائے آپ نے تصدیق و تصویب کیوں فرمائی؟ فرزدق کی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے، کیوں کہ جو روایات آگے آرہی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق سے ملاقات کے کافی دنوں بعد تک حسین کو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ کوفہ اب ان کے ساتھ نہیں ہے۔

مسلم بن عقیل کے انجام کی خبر

ابو مخنف عدی بن حرملہ کی روایت بیان کرتا ہے جو اس نے عبد ربہ کے حوالے پیش کیا ہے کہ ہم لوگ مکہ میں تھے اور حج کرلیا تھا۔ ہمیں حسین کے پاس پہنچ جانے کے علاوہ اور کوئی فکر نہ تھی۔ چنانچہ ہم چل پڑے، یہاں تک

کہ ان تک پہنچ گئے اور انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ پھر ہم نے عرض کی؛ "اے ابو عبد اللہ! کیا آپ نے ان دونوں سواروں کو دیکھا؟ انھوں نے فرمایا، ہاں۔ ہم نے عرض کیا؛ ان کا گمان ہے کہ شہر (کوفہ) سے اس وقت چلے تھے جب مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو قتل کیا جا چکا تھا۔ انھوں نے سڑک پر ان کے سر لٹکے ہوئے دیکھے۔
ملاحظہ فرمائیں کہ گذشتہ باب میں ہم ابو مخنف کا وہ حوالہ بھی پیش کر چکے ہیں جس کے مطابق قبیلہ مذحج نے مسلم اور ہانی کے لاشے حکومت سے حاصل کر کے ان کے کفن دفن کا انتظام کیا تھا اور اب راوی کہہ رہا ہے کہ ان کے لٹکے ہوئے سر ان خیالی سواروں نے دیکھے تھے۔

خیر، پھر ابو مخنف کے مطابق اس کا راوی کہتا ہے، "اے ابو عبد اللہ! ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ آپ یہیں سے واپس ہو جائیں، کیوں کہ کوفہ میں آپ کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ لیکن حسین نے فرمایا، ان لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ اس سے ہم سمجھ گئے کہ سفر کے بارے میں ان کا ارادہ پختہ ہے۔ رات انھوں نے وہیں گذاری اور جب صبح ہوئی تو اپنے آدمیوں سے فرمایا، پانی بکثرت جمع کر لو اور اپنے گھوڑوں کو بھی خوب پلا لو۔"

اس روایت کے برخلاف طبری کہتا ہے کہ راہ میں ایک منزل زبالہ آتی ہے جہاں سے کوفہ زیادہ دور نہ تھا۔ اس منزل پر حسین کو وہ قاصد ملا جسے کوفہ سے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ پیغام دے کر بھیجا تھا:

"میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ چل بھی نہ پائیں کہ میرا قتل ہو جائے، پس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں لوٹ جائیں۔ کوفہ والوں کا بھروسہ نہ کریں، ان لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ تو آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے لگے تھے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 211)

لوگ کھسکنے لگے

ابو مخنف کے مطابق، حسینی قافلہ کا جس بستی سے بھی گذر ہوتا، بکثرت لوگ آپ کے ساتھ ہو جاتے تا آنکہ آپ زبالہ پہنچ گئے اور وہاں قیام کیا۔ پھر آپ تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا اور نبی پر درود بھیجنے کے بعد بلند آواز میں فرمایا؛ "لوگو! تم میرے ساتھ اس خیال سے جمع ہو گئے ہو کہ عراق پر میرا قبضہ ہے، حالاں کہ مجھے صحیح اطلاع یہ ملی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو قتل کیا جا چکا ہے اور ہمارے شیعوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے، تو تم میں سے جن میں تلواریں کھانے اور نیزوں کے کچوکے برداشت کرنے کا حوصلہ نہ ہو، وہ ہمارے ساتھ چلے ورنہ یہیں سے لوٹ جائے۔ ایسے لوگوں پر میرے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں۔"

یہ سن کر لوگ چپ ہو گئے اور دائیں بائیں کھسکنے لگے، حتیٰ کہ آپ کے پاس اپنے گھر والوں اور ملازموں کے سوا کوئی نہ رہا۔ ان لوگوں نے کہا؛ بخدا ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک اپنا بدلہ نہ لے لیں یا پھر درجہ بدرجہ موت کا مزہ چکھیں۔"

ابو مخنف کے مطابق، یہ تعداد میں کچھ ستر کے اوپر لوگ تھے اور یہ وہی لوگ تھے جو مکہ سے حسین کے ساتھ چلے تھے۔ حسین جانتے تھے کہ باقی لوگ محض اس لیے ان کے ساتھ ہو گئے تھے کہ انھیں لگا تھا کہ عراق پر آپ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پھر حسین روانہ ہوئے اور ثعلبیہ پہنچ گئے، جہاں ایک نصرانی شخص اپنی ماں کے ساتھ آیا اور وہ دونوں آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ سوال اٹھتا ہے کہ عراق میں نصرانی گھرانا کہاں سے آگیا؟ اگر شام کے علاقے کی بات ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ اس ڈرامائی انداز میں ان ماں بیٹے کا آنا محض یہ دکھانے کے لیے ہے کہ خود مسلمان تو ساتھ دینے سے کترا رہے تھے، لیکن ایک نصرانی اور اس کی ماں نے آپ کی محبت میں اسلام قبول کر لیا۔

حُر بن یزید ریاحی کی آمد

حسین کا قافلہ ابھی ثعلبیہ میں ہی تھا کہ دور سے گرد اٹھتی نظر آئی، حسین نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، "یہ سیاہی کیسی ہے؟" انھوں نے کہا "ہم کچھ نہیں کہہ سکتے"۔ پھر کسی نے بتایا کہ "کوئی قافلہ آتا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا، راستے سے ہٹ جاؤ۔ ابو مخنف کا راوی کہتا ہے کہ جب ہم راستے سے ہٹ گئے تو وہ لوگ بھی ہماری ہی سمت کو

ہٹ گئے۔ دیکھتے کیاہیں، ایک ہزار سوار ہیں اور ان کی قیادت حُر بن یزید ریاحی کر رہاہے۔ وہ لوگ حسین کے مقابل آکر کھڑے ہوگئے اور کہا؛ اے ابو عبداللہ! ہمیں پانی پلوایئے۔ آپ نے حکم دیا، "ان لوگوں کو پانی پلاؤ اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیر کر دو۔ چنانچہ ان سب کو پانی پلایا گیا۔" ایک ہزار فوجیوں اور ان کے گھوڑوں کو پانی پلوانے کا یہ انداز بھی کتنا ڈرامائی ہے۔ حسینی قافلے کے 72 افراد نے ثعلبیہ کے جن کنوؤں سے پانی بھرا تھا، یہ ایک ہزار فوجی بھی ان کنوؤں سے پانی پی سکتے تھے لیکن راوی کو حسینی قافلے پر پانی کی بندش کی تمہید تو ابھی سے شروع کرنی تھی کہ پانی پلانے والوں پر پانی کی پابندی عائد کر دی گئی۔

حسین اُلٹے قدم واپس ہونے کو تیار

بہر حال، حسین نے دونوں طرف کے لوگوں کو نماز پڑھانے کے بعد تقریر فرمائی؛

"لوگو! اللہ کے اور تمھارے سامنے میرا عذر یہ ہے کہ تمھارے خط میرے پاس آنے لگے کہ ہمارے پاس آجایئے آپ کے سوا ہمارا کوئی امام نہیں۔ اب اگر تم لوگوں کو یہ بات ناگوار ہو تو میں تمھارے پاس سے واپس ہونے کو تیار ہوں، جدھر بھی میرا جی چاہے۔"

لیجیے صاحب، ہوا تو یہ باندھی جاتی ہے حسین کا خروج دین کی حفاظت کے لیے تھا اور کربلا کا واقعہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حسین اپنے نانا کا دین بچانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور اسی مقصد کے لیے آپ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اب اپنی تقریر میں حُر بن یزید ریاحی سے کہہ رہے ہیں کہ واپس جانے دو۔ کیوں؟ ظاہر ہے کہ یہ تقریر از خود بتارہی ہے کہ حسین طلب خلافت کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور حالات ناساز گار دیکھ کر اس اقدام سے باز آنا چاہتے تھے۔ آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جو وفود آپ کے پاس گئے اور جو خطوط کے تھیلے آپ کو ملے، وہ محض چند لوگوں کی شرارت تھی۔ پھر حُر کے لشکر میں کوئی یہودی نہ تھا، سب مسلمان تھے اور ارکان مذہبی کے پابند، حتیٰ کہ حسین کی امامت میں ان فوجیوں نے بھی نماز ادا کی۔

طبری نے حسین کے پوتے محمد الباقر کی ایک روایت بھی درج ہے، ہم اس طویل روایت کے مطلوبہ ٹکڑے پر آتے ہیں؛

"حسین بن علی، مسلم بن عقیل کا خط پانے کے بعد کوفے کی طرف متوجہ ہو گئے، حتیٰ کہ جب آپ وہاں پہنچے کہ قادسیہ کے اور آپ کے درمیان بس تین میل کا فاصلہ تھا تو وہاں حر بن یزید التمیمی سے ملاقات ہوئی۔ حر نے دریافت کیا، کہاں کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا۔ حر نے عرض کی آپ لوٹ جائیں، اس لیے کہ میں (جو وہیں سے آرہا ہوں) آپ کے لیے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر نہیں آرہا ہوں۔ اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا، لیکن مسلم بن عقیل کے بھائی آپ کے قافلے میں تھے، وہ بولے کہ خدا کی قسم ہم تو بغیر بدلہ لیے یا اپنی جان دیے، نہیں واپس ہوں گے، تب آپ نے فرمایا کہ تمھارے بعد میرے لیے زندگی میں کیا مزہ ہے؟ اور یہ کہہ کر آپ آگے چل دیے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 220)

محمد الباقر کی یہ روایت اگر سنداً درست ہے اور یقیناً ہونی ہی چاہیے، چونکہ انھوں نے اپنے والد ماجد علی بن حسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی، جو اس سفر میں اپنے والد حسین کے ساتھ تھے (خود باقر بھی اس وقت دو ڈھائی سال کی عمر کے تھے، یعنی قافلہ کربلا میں شامل تھے)، تو یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ حسین نے حق و باطل اور اپنے نانا کے دین کو بچانے کا ارادہ ترک کر کے واپسی کا ارادہ فرمالیا تھا، لیکن برادران مسلم کے احتجاج کے سبب وہ آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئے۔

سمت سفر کی تبدیلی اور نزول کربلا

طبری کی روایت جہاں یہ بتاتی ہے کہ مسلم بن عقیل کے احتجاج پر واپسی کا ارادہ ترک کر کے آگے بڑھ گئے لیکن پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ آگے کی جانب بڑھتے ہی ابن زیاد کا گھڑ سوار دستہ سامنے آگیا جو قادسیہ میں متعین تھا۔ اسے دیکھ کر حسین نے اپنا رخ قادسیہ اور کوفے سے ہٹا کر کربلا کی طرف کر دیا۔ یہاں قارئین پر واضح رہنا چاہیے کہ کربلا، قادسیہ سے بجانب شمال اور کوفہ سے بجانب شمال مغرب 10-12 کلو میٹر آگے ہے اور حسین جنوب مغرب سے کوفہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بہر حال، طبری کہتا ہے:

"(پس آپ آگے کو چل دیے) مگر چلتے ہی آپ کو عبید اللہ بن زیاد کا مقدمتہ الجیش نظر آیا۔ اسے دیکھ کر آپ نے کربلا کی طرف رخ موڑ لیا۔ وہاں آپ نے بانس اور نرکل کے جنگل کو اپنی پشت پر لیا اور مضبوطی سے جم گئے

تاکہ دشمن سوائے ایک طرف کے کہیں اور سے حملہ نہ کرسکے۔ یہاں نزول فرما کر آپ نے اپنے خیمے لگوادیے اور آپ کے ساتھ 45 سوار اور 100 پیادے تھے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 220)

چونکہ ابو مخنف اتنی آسانی کے ساتھ حسین کو کربلا پہنچنے دینا نہیں چاہتا، لہٰذا اس کے مطابق حسین کا سفر جاری رہا اور حُر آپ کے ساتھ لگے رہے، حتیٰ کہ بنو مقاتل کے محل پہنچ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک رہزن کا وہاں خیمہ ایستادہ ہے، جس کا نام عبد اللہ جعفی تھا۔ حسین نے اسے بلوایا اور جب وہ حاضر ہوا تو فرمایا؛ کہو میاں! ایسی توبہ کے لیے تیار ہو جو تمھیں تمام گناہوں سے پاک کردے؟ اس نے کہا؛ اے فرزند رسول! وہ توبہ کیسی ہونی چاہیے؟ آپ نے فرمایا، اہل بیت کی مدد کرو۔ اس نے کہا؛ میں کوفہ سے اسی خوف کے سبب چلا تھا کہ کہیں ابن زیاد آپ کے خلاف لڑنہ پڑے۔ لیکن اب (میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ) آپ میرا یہ گھوڑا لے لیں۔ یہ ایسا ہے کہ جب میں نے اس پر کسی کا پیچھا کیا اسے پالیا اور جب کبھی فرار ہوا تو نجات پائی۔ میری یہ تلوار بڑی کاٹ والی ہے اور زرہ بھی مگر (اور باتوں سے) مجھے معاف رکھیں۔ آپ نے فرمایا؛ جب تم نے اپنی جان کے بارے میں بخل کیا تو ہمیں تمھارے مال کی ضرورت نہیں اور پر یہ آیت پڑھی؛ میں گمراہ کن لوگوں کو اپنا دست و بازو بنانے پر نہیں۔ میں نے اپنے نانا رسول اللہ سے سنا ہے۔"

اول تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ رسول اللہ کی حیات میں حسین اتنے کمسن تھے کہ انھیں اپنے نانا کا چہرہ بھی یاد نہ تھا، چہ جائیکہ ان کی کوئی بات۔ دوسری بات یہ کہ ابو مخنف کا یہ بیان بڑا دلچسپ ہے کہ ایک ڈاکو اطمینان کے ساتھ ٹھاٹھ سے خیمہ ڈال کر رہ رہا ہے اور حسین کے بلاوے پر وہ بڑے اطمینان سے وہاں پہنچتا بھی ہے جہاں حُر بن یزید سرکاری فوج کے ساتھ موجود ہے لیکن پوری فوج پر شاید اتنی ہیبت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ اس ڈاکو کو گرفتار نہ کرسکے۔ ایک طرف حکومت کا یہ اہتمام دکھایا جاتا ہے کہ جو بھی خروج کرے، اسے قتل کر دیا جائے لیکن دوسری طرف ایک ڈاکو پوری آزادی کے ساتھ گھوم پھر رہا ہے اور تنہا مل جانے کے باوجود کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا اور کیا کہنے اس ڈاکو کے جذبہ کے جو نواسہ رسول جان قربان کو تیار ہے لیکن اپنا مشغلہ یعنی رہزنی چھوڑنے کو تیار نہیں۔

ابو مخنف کا یہ ڈاکو عبد اللہ الجعفی کو حسین کی مدد نہ کرنے پر بڑی ندامت ہوئی، وہ کف افسوس ملتا رہا اور ہائے ہائے کرتا ہوا پانچ اشعار فی البدیہہ بھی کہہ ڈالے۔

راوی کہتا ہے کہ قافلہ چلتا رہا، ایک شخص جو کوفہ کی طرف سے آرہا تھا، اس نے حُر کو سلام کر کے ابن زیاد کا خط انھیں پکڑا دیا، جس کا مضمون یہ تھا:

"امابعد، جب تم میرا یہ خط پڑھ رہے ہو تو اسی جگہ سے جہاں تمھیں میرا یہ خط ملے حسین کو گھیر کر لے آؤ۔ میں نے اپنے قاصد کو حکم دے دیا ہے کہ تم سے اس وقت تک جدا نہ ہو جب تک میرے حکم کی تعمیل شروع نہ کر دو۔ والسلام۔"

حُر نے یہ خط پڑھ کر حسین کو دکھایا اور سب کے سب چل پڑے، تاآنکہ کربلا پہنچ گئے۔

اس روایت میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ مکہ سے کوفہ جانے والا شخص کربلا سے ہو کر کوفہ نہیں جاتا بلکہ کوفہ جانے کا راستہ چھوڑ کر جب دمشق کی راہ پکڑ لے تب کربلا پہنچتا ہے۔ یہ روایات تو خود چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ حسین دمشق کی راہ پر گامزن تھے جو سیدھا یزید کی بیعت قبول کرنے کی جانب اشارہ ہے۔ لیکن اس داستان کو جغرافیہ سے کیا غرض۔ اسے تو حسین کو گھیر گھار کر کربلا پہنچانا ہے۔

کچھ کربلا کے بارے

ابو مخنف کہتا ہے کہ یہ بدھ کا دن تھا۔ وہاں حسین کا گھوڑا رک گیا۔ آپ نے دوسرا گھوڑا بدلا مگر وہ بھی ایک قدم نہ چلا۔ پھر آپ نے یکے بعد دیگرے سات گھوڑے بدلے مگر سب کا یہی حال رہا۔ جب آپ نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا؛ لوگو! اس زمین کا نام کیا؟ انھوں نے کہا، خط غاضریہ۔ آپ نے پوچھا؛ اس کے علاوہ بھی کوئی نام ہے؟ انھوں نے کہا، اسے نینوا بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے پوچھا، کوئی اور نام ہے؟ انھوں نے کہا، شاطی الفرات۔ آپ نے پوچھا، کوئی اور نام بھی ہے؟ انھوں نے کہا؛ اسے کربلا بھی کہا جاتا ہے۔ اس پر حسین نے ایک دلدوز آہ کی اور فرمایا؛ ارض کرب وبلا (بے چینی اور بلاؤں کی زمین)۔ واضح رہے کہ کربلا کو "ارض کرب وبلا" کہنا بعد کی ایجاد ہے۔ اس کا اصل نام "کربغتہ" تھا یعنی ایسی صاف وشفاف زمین جو غلہ پچھوڑنے کے کام آتی تھی، اس کے نواح میں پانی کے متعدد چشمے تھے، دریائے فرات تو کوسوں دور تھا۔

حسین گھوڑے سے اترے اور کہا، "اسی خاک کا میرے نانا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" (پھر وہی؟ تین سال کے بچے کو چہرہ یاد نہیں رہتا، وعدہ کیسے یاد رہ گیا؟)

عمر بن سعد کو کمان

بہر حال، ابو مخنف کہتا ہے کہ اُدھر ابن زیاد نے اعلان کیا کہ کون ہے جو حسین کا سر میرے پاس لائے اور اس کے صلے میں دس برس کے لیے زئی (رے) کی حکومت لے لے۔ کتنی غیر منطقی بات ہے کہ ایک گورنر کسی کو کوئی صوبہ دینے کا مختار کیسے ہو سکتا ہے؟

بقول راوی، ابن سعد کھڑے ہوئے اور اس کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ واضح رہے کہ ہم ابن سعد کو متعارف کرا چکے ہیں کہ وہ حسین کے قریبی رشتے دار تھے۔ اغلب ہے کہ ابن زیاد نے ان کو اسی قرابت خاص کے سبب حسین سے گفت و شنید کے لیے بھیجا ہو گا، تا کہ معاملہ بحسن خوبی انجام پا جائے۔

جنگ مغلوب

عمر بن سعد کی آمد

ابو مخنف کہتا ہے کہ پہلا جھنڈا جو حسین سے جنگ کے لیے لہرایا گیا وہ عمر بن سعد کا جھنڈا تھا اور اس کے نیچے چھ ہزار سوار تھے۔ پھر اس نے شبعث بن ربعی کو بلا کر جھنڈا دیا اور چار ہزار سوار اس کے تحت کر دیے۔ پھر عروہ بن قین کو طلب کر کے جھنڈا دیا اور اس کے ساتھ بھی چار ہزار سوار کر دیے۔ پھر اس نے سنان بن انس کو بلا کر جھنڈا دیا اور اس کے ساتھ بھی چار ہزار سوار کر دیے۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سب 80،000 کوفی تھے، ان میں ایک بھی شامی یا حجازی نہیں تھا۔

ابو مخنف بیچارے نے تو صرف 80 ہزار فوج کی تعداد بتائی ہے، جب کہ دوسرے شیعہ راویوں نے لاکھوں کی تعداد بیان کی اور لاکھوں کی یہ فوج صرف 72 افراد سے لڑنے کے لیے چند دن میں مہیا کر لی گئی۔

پھر ابن سعد نے کثیر بن شہاب کو بلایا اور کہا؛ حسین کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہاں کیوں آئے ہیں اور کس بنا پر انھوں نے یہ قدم اٹھایا ہے؟ وہ آیا، حسین کے سامنے کھڑا ہوا اور زور سے پکارا؛ اے حسین! تم یہاں کس غرض سے آئے ہو اور یہ اقدام تم نے کیوں کیے؟ حسین نے (اپنے ساتھیوں سے) پوچھا: تم اس شخص کو جانتے ہو؟ ابو تمامہ صیدادی نے کہا؛ یہ روئے زمین کا بدترین شخص ہے۔ آپ نے فرمایا: پوچھو یہ کیا چاہتا ہے؟ اس نے کہا؛ میں حسین کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ زہیر بن قین نے کہا؛ اپنے ہتھیار ڈال دو اور چلے آؤ۔ اس نے کہا؛ ایسا نہیں کروں گا۔ زہیر نے کہا؛ جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔

وہ ابن سعد کے پاس گیا اور اسے یہ بات بتادی۔ اب ابن سعد نے قبیلہ خزیمہ کے ایک شخص کو بلایا اور کہا: حسین کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو یہاں کیوں آئے ہو اور ان کے اس اقدام کا سبب کیا ہے؟ وہ آیا اور حسین کے

مقابل کھڑے ہو کر آواز دی۔ حسین نے پوچھا: تم لوگ اسے جانتے ہو؟ انھوں نے کہا؛ ویسے تو یہ بھلا آدمی ہے مگر اس وقت یہاں شریک ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا؛ اس سے پوچھو کیا چاہتا ہے؟ اس نے کہا: حسین کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ زہیر نے کہا: تو پھر ہتھیار ڈال دو اور آجاؤ۔ اس نے کہا: بسر و چشم، اور ہتھیار ڈال کر پاس آگیا۔ آپ کے ہاتھ پاؤں چومے اور عرض کیا: میرے آقا آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں اور کیا مقصد آپ کو ہمارے پاس لایا ہے؟ آپ نے فرمایا؛ تمھارے مراسلے۔ اس نے کہا: جن لوگوں نے آپ کو خط بھیجے تھے، وہ سب اس وقت ابن زیاد کے خاص آدمی بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم اپنے صاحب کے پاس جاؤ اور انھیں یہ بات بتا دو۔ اس نے کہا: میرے آقا کون ہے جو جنت کے بدلے جہنم خریدے، میں آپ کے پاس سے جدا نہیں ہوں گا تا آنکہ آپ کے حضور جان دے دوں۔ حسین نے فرمایا؛ خدا تعالیٰ تمھارا ساتھ اسی طرح دے جس طرح تم نے دل و جان سے ہمارا ساتھ دیا، پھر وہ حسین ہی کے پاس رہا، تا آنکہ شہید ہو گیا۔

صلح کی بات چیت

اس کہانی کو سنا کر ابو مخنف کہتا ہے کہ پھر ابن سعد نے فرات کو عبور کر لیا۔ وہ ہر رات نکلتا اور فرش بچھا کر حسین کو بلا لیتا۔ آدھی رات تک دونوں باتیں کرتے رہتے۔ اب قارئین ہی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ کوئی مناسبت ہے اوپر والی کہانی اور اس بیان میں؟ اوپر والی کہانی میں کہاں تو ابن سعد کو یہ تک پتہ نہ تھا کہ حسین کی آمد کی غرض کیا ہے اور اب یہاں آدھی آدھی رات تک باتیں ہو رہی ہیں اور باتیں بھی یارانے کی۔ پھر دریائے فرات عبور کرنے کی کہانی، جو لغو بیانی ابو مخنف نے بیان کی ہے وہ بھی قابل غور ہے، جب کہ فرات کربلا سے کوسوں دور تھا۔

عمر بن سعد کو قاتل حسین کہا جاتا ہے، جب کہ خود ابو مخنف کی روایت بتا رہی ہے کہ حسین اور ابن سعد کے مابین ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں ابن زیاد کو عمر بن سعد کا جو خط ملتا ہے، اسے طبری یوں نقل کرتا ہے:

"خدا نے آتش (اختلاف) کو بجھا دیا، اتحاد و اتفاق پیدا کر دیا اور امت کی اس سے بہتری چاہی۔" (طبری، جلد6، صفحہ 235)

اس خط کو پڑھ کر بے ساختہ ابن زیاد کے منھ سے یہ الفاظ نکلے:

"یہ خط ایک ایسے شخص نے لکھا ہے جو اپنے امیر کا صحیح مشیر ہے اور اپنی قوم کا مشفق ہے، ہاں تو میں نے قبول کیا۔"

ان دونوں خطوط سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حسین کے پاس اسی لیے بھیجا تھا تاکہ وہ انھیں سمجھا بجھا کر یزید کی بیعت کے لیے راضی کر لے اور اس کی یہ مراد پوری ہوئی، اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حکومت وقت کے دونوں نمائندے اس مسئلے کا حل خونریزی کی بجائے امن و آشتی سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن آخر ایسا کیا ہوا کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا؟ آخر عمر بن سعد نے حسین کو کس بات پر راضی کیا تھا؟

محمد الباقر کی ہی روایت کا سرا اگر ہم تھام کر چلیں تو ہمیں ان شرائط کا علم ہوتا ہے جو حسین نے خود عمر بن سعد کو پیش کی تھیں اور ابن سعد نے انھیں تسلیم کر لیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

"پس جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو حضرت حسین نے ان سے کہا کہ تین باتوں میں سے ایک قبول کر لو، یا تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس ہو جانے دو، یا یزید کے پاس چلا جانے دو اور یا کہو تو سرحدوں کی طرف (جہاں میدان جہاد گرم ہے) نکل جاؤں۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 220)

ابن زیاد کی شرط

ابن سعد نے حسین کی اس پیشکش کو قبول کر کے ابن زیادہ کو خط لکھ کر اطلاع دی جس پر ابن زیاد کا تاثر ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، لیکن وہ ایک دور اندیش شخص تھا اور وہ حسین کے سابقہ ریکارڈ سے واقف تھا کہ کس طرح بیعت کا وعدہ کر کے وہ مدینہ سے مکہ فرار ہوئے تھے، لہٰذا اس نے احتیاطاً کہا، "انھیں پہلے میں ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہو گا۔" اس پر حسین نے کہا کہ نہیں، یہ تو بخدا کبھی نہیں ہو گا۔ (ایضاً)

یہاں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ کیا ابن زیاد کا مطالبہ کچھ انوکھا تھا؟ اس سے پہلے بھی تمام مملکت اسلامیہ میں عام و خاص حتیٰ کہ صحابہ بھی عاملان حکومت کے ہاتھوں پر امیر المومنین کی بیعت کرتے چلے آئے ہیں، چونکہ آئینی اعتبار سے نمائندے کی حیثیت ذاتی نہیں رہتی۔ امیر کوفہ عبید اللہ بن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کرنا خود امیر المومنین کے

ہاتھ پر بیعت کرنے کے مترادف ہے۔ ابن زیاد کا یہ مطالبہ حکمت عملی کا بہترین نمونہ تھا، وہ ایک طرف تو حسین سے عملاً بیعت کی توثیق کرالینا چاہتا تھا تاکہ وہ دمشق جاکر اپنا ارادہ نہ بدل لیں جیسا کہ مدینہ سے مکہ جاکر انھوں نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا؛ دوسری طرف اس بیعت سے وہ تمام آلات حرب اور ہتھیار جو حسینی قافلے کے ساتھ تھے، انھیں بھی اپنے قبضے میں لے لیا جاتا تاکہ بعد میں کسی خطرے کا امکان نہ بچے اور حسین کسی کے بہکاوے میں آکر ایک بار پھر حکومت کے خلاف جارحانہ اقدام نہ کرپاتے۔ لیکن مسلم بن عقیل کے بھائیوں کے سینے میں دہکتی آگ نے تاریخ بدل کر رکھ دی۔

فوجی دستہ پر حملہ

ابن سعد اور حسین کے درمیان جو مصالحت کی ایک خوشگوار فضا بنی تھی، اچانک جدال و قتال میں بدل گئی۔ محمود احمد عباسی کے مطابق، ان لوگوں نے جنھوں نے اپنے پیش رووں کی تقلید میں جمل کی ہوتی ہوئی صلح کو جنگ میں بدل دیا تھا، انھوں نے اس اشتعال کو اس شدت سے بھڑکا دیا کہ انتہائی ناعاقبت اندیشی سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے گھیر اڈالے ہوئے تھے، ان پر اچانک قاتلانہ حملہ کردیا گیا۔ مستشرقین نے بھی اپنی بےلاگ تحقیق میں اسی بات کا اظہار کیا ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے مقالہ نویسوں نے لکھا ہے کہ: "گورنر (کوفہ) عبید اللہ ابن زیاد کو یزید نے حکم دیا تھا کہ (حسینی قافلہ کے) ہتھیار لے لینے کی تدابیر کرے اور (صوبہ) عراق میں ان کے داخل ہونے اور جھگڑا اور انتشار پھیلانے سے باز رکھے۔ کوفہ کے شیعان علی میں سے کوئی بھی (مدد کو) کھڑا نہ ہوا۔ حسین اور ان کے مٹھی بھر متبعین نے اپنے سے بدرجہا طاقتور فوجی دستہ پر، جو ان سے ہتھیار رکھوا لینے کو بھیجا گیا تھا، غیر مآل اندیشانہ طور سے حملہ کر دیا۔" (صفحہ 1162)

حسین اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کے اس اقدام نے ان کے عزیزوں کی قیمتی جانوں کو جس طرح ضائع کیا، اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے، کم ہے لیکن اس کا ذمہ دار نہ تو ابن زیاد ہے اور نہ عمر بن سعد، حتیٰ کہ میں اس کا ذمہ دار برادران مسلم بن عقیل کو بھی نہیں گردانتا جن کے انتقام کے شعلوں نے پورے خاندان کو جلا کر خاکستر کر دیا بلکہ اس کے ذمہ دار تنہا حسین ہیں جن میں قیادت اور تدبر کی کمی کے علاوہ جاہ و منصب کی حد درجہ حرص شامل تھی۔

ابو مخنف خود ایک جگہ کہتا ہے کہ حسین کے مقتول ہو جانے پر ابن سعد پر رنج اور صدمہ سے ایسی رقت طاری ہوئی کہ بے اختیار زار و قطار رونے لگے اور ان کے رخسار اور داڑھی آنسوؤں سے تر بتر ہو گئی۔ ظاہر ہے جو شخص اپنی قرابت داری کے سہارے اس امید پر حسین کے پاس آیا تھا کہ وہ مفاد ملت کی خاطر انھیں خون خرابہ سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا، اسے اتنا گہرا صدمہ پہنچنا فطری تھا۔ یوں تو شیعہ راویوں اور مورخین نے کربلا کے مظالم کی بھیانک تصویریں کھینچنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن عمر بن سعد کی حسین سے قرابت خاص کا خیال رکھ کر یہ بھی ساتھ ساتھ کہتے جاتے ہیں؛ "چونکہ عمر بن سعد کو حسین سے قتال کرنے میں کمال درجہ کراہت تھی" (ناسخ التواریخ، کتاب دوم، جلد 2، صفحہ 234)

بہر حال، ابو مخنف اور دیگر راویوں نے کربلا کے حالات کو جس مبالغہ کے ساتھ بیان کیے ہیں، اس میں انتہائی درجہ کا جھوٹ شامل ہے جو ہم بوقت ضرورت حسب سابق نشان زد کرتے جائیں گے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے کہ صدیوں سے اس واقعہ کو ایک سیاسی مذہب بنا کر لوگوں کو کس طرح بیوقوف بنایا جارہا ہے۔

ابو مخنف کے مطابق، ابن سعد اور حسین کی اس رات رات بھر دوستانہ میٹنگ کو دیکھ کر خولی بن یزید نے ابن زیاد کو ایک خط لکھ کر شکایت کی کہ عمر بن سعد کے دل میں حسین کی محبت اور الفت پیدا ہو گئی ہے، لہٰذا اسے معزول کر کے یہ کام میرے سپرد کر دیں۔

بندش آب کا حکم اور حسین کی تقریر

ابو مخنف کہتا ہے کہ ابن زیاد نے اس کے جواب میں ابن سعد کو خط لکھ کر سرزنش کی اور اسے حکم دیا کہ ان پر پانی پینے کا راستہ بند کر دو، یہود و نصاریٰ پر پانی حلال ہے لیکن حسین اور ان کے گھر والوں پر یہ ممنوع ہے۔ لہٰذا ابن سعد نے تعمیل حکم کرتے ہوئے الغاضریہ کے گھاٹ پر پہرہ لگا دیا۔

صبح ہوئی تو حسین نے دیکھا کہ لوگ آپ کے خلاف صف بستہ ہیں، انھوں نے اپنی اونٹنی منگوائی اور اس پر سوار ہو کر ان لوگوں کے سامنے گئے۔ پھر اللہ کی حمد و ثنا کی اور نبی پر درود پڑھ کر فرمایا:

"لو گو! ذرا بتاؤ میں کس گھرانے کا فرد ہوں، پھر اپنے دل میں غور کرو مجھے قتل کرنا تمھارے لیے کیوں کر جائز ہے، جب کہ میں تمھارے نبی کا نواسہ ہوں اور ان کے اس چہیتے کا بیٹا ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا اور خدا اور رسول کی تصدیق کی، اور ہر اس بات کی جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ کیا سید الشہدا سید حمزہ میرے باپ کے چچا نہیں، کیا جنت میں پرواز کرنے والے جعفر میرے چچا نہیں، کیا تم کو میرے نانا کا ارشاد میرے اور میرے بھائی حسن کے بارے میں نہیں پہنچا کہ یہ دونوں نوجوانان جنت کے سردار ہیں۔ اور آپ نے فرمایا میں تمھارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں؛ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اخلاف و اہل بیت، اگر تم نے میری اس بات کی تصدیق کی تو یہ تصدیق ایک سچی بات کی ہو گی۔ ورنہ پوچھ لو جابر بن عبد اللہ انصاری سے، ابو سعید خدری سے، سہیل بن سعدی سے، زید بن ارقم سے اور انس بن مالک سے، کیوں کہ انھوں نے یہ بات میرے نانا رسول اللہ سے سنی ہے۔"

اس پر شمر نے ان سے کہا کہ اگر آپ کی بات میرے دل میں اترنے والی ہوتی تو میں ایک حرف پر اللہ کی بندگی کرنے والا بن جاتا۔ پھر حسین نے ندا دی:

"افسوس اے شبث ربعی اور اے کثیر بن شہاب اور اے فلاں والے فلاں کیا تم لوگوں نے مجھے نہیں لکھا کہ آپ ہمارے پاس آجایئے، ہمارا نفع آپ کا نفع اور آپ کا نقصان ہمارا نقصان۔ انھوں نے کہا؛ ہم نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔ اس پر حسین نے فرمایا؛ بخدا میں ذلیل آدمی کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح یہاں سے فرار ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی؛ میں اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، ہر اس متکبر سے جو آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔"

غور فرمایئے، ایک طرف دشمن قتل کرنے کے لیے جمع ہیں لیکن دوسری طرف وہ آپ کے ایسے مطیع بھی ہیں کہ خطبہ سننے کے لیے چپ ہو گئے۔ لیکن فی الحال ہم اس سوال کو مؤخر رکھتے ہوئے دوسرا سوال یہاں رکھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ تقریر نواسہ رسول کے دامن پر ایک بڑا داغ نہیں ہے؟ کل تک سارے اعزا و اقارب حسین کو کوفہ جانے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان میں صرف عبد اللہ بن عباس اور ان کے بھائی ہی نہیں بلکہ مقتدر صحابہ بھی شامل تھے لیکن حسین اپنے نانا کا دین بچانے کے لیے اس یزید کے خلاف مورچہ بندی کرنے نکل پڑے تھے

جو ان کی نظر میں خلافت کے لائق نہ تھا اور اب یہ حال تھا کہ وہ اسی یزید کی فوج کے سامنے اپنے اور اپنے عیال کی جان کی بھیک مانگ رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے، حتیٰ کہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو بھی تیار تھے۔ کیا رسول کی غیرت اور ہاشمی خون کا یہی رنگ تھا؟ جو لوگ آپ کا خون بہانے کے لیے صف بستہ تھے، ان کے سامنے حسین اپنی نسبی عظمتوں کی دہائی دے رہے تھے، کیا یہ باتیں حسین کے لائق مرتبہ تھیں؟ حسین ہی کیا، ایسے واسطے دینا کسی بھی باغیرت شخص کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔

تُو تڑاخ

پھر حسین ہی کیا، ایسی تقریروں کا لمبا سلسلہ ہے، ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی معرکہ کارزار نہیں، تقریری مقابلے کی تقریب ہو۔ جب حسین اپنی تقریر ختم کر کے اونٹنی سے نیچے اترتے ہیں اور دشمنوں کا ہجوم آگے بڑھنے لگتا ہے تو زہیر بن قین حسینی لشکر سے باہر آئے اور تقریر شروع کر دی۔ ان کی تقریر جب لمبی ہو گئی تو شمر نے ان کی جانب تیر پھینکا اور بولا؛ بولنا بند کر، تیری بکواس نے ہمارا دماغ چاٹ لیا ہے۔" اس پر زہیر تپ گئے اور گالیاں دینی شروع کر دیں، "او پیچھے کی طرف پیشاب کرنے والے کی بیٹے تو نرا جانور ہے۔ تجھے سخت عذاب کی بشارت ہو۔" شمر نے کہا "میں تجھے اور تیرے صاحب کو قتل کرنے والا ہوں۔" زہیر نے کہا، "تیرا ناس جائے تو مجھے حسین کے ساتھ قتل ہو جانے سے ڈراتا ہے، ہمیں تو تمھارے زندہ رہنے کے بجائے ان کے ساتھ مر جانا زیادہ محبوب ہے۔" پھر وہ (زہیر) اپنے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، "اے گروہ مہاجرین وانصار! اس ملعون کتے کی اور اس جیسے دوسروں کی بات سے دھوکہ مت کھانا، کیوں کہ اسے محمد کی شفاعت ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ آپ کی ذریت اور ان کے مددگاروں کو قتل کریں گے، ان کا دائمی ٹھکانہ جہنم ہے۔"

سب سے پہلی بات یہ کہ کربلا میں مہاجرین اور انصار کہاں سے آ گئے؟ دوسری بات یہ کہ زہیر بن قین کی تقریر میں جو کچھ لعنت وملامت، گالیاں کوفیوں کو ہے، ان سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ حسین اور ان کے اہل خانہ اولاد فاطمہ اور ذریت رسول اللہ ہیں۔ حالاں کہ ان کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں عثمانی گروہ کے تھے اور اتفاق سے حج واپسی کے دوران حسین کے قافلے کے ساتھ ہو لیے تھے۔ بہر حال، ایک عثمانی الاصل آدمی بھی صرف اسی

"ذریت محمد" اور "ابن بنت رسول اللہ" کے حوالے سے یزیدی کوفیوں کو لعنت وملامت یا ان سے اپیل کرے، یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

عباس کی کرتب بازی اور قتل

ابو مخنف کہتا ہے کہ حسین اور آپ کے ساتھیوں کو پیاس نے ستایا تو حسین نے اپنے بھائی عباس سے فرمایا: بھائی اپنے سب گھر والوں کو جمع کرو اور کنواں کھودلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا مگر اس میں انھیں پانی نہ ملا۔

کمال ہے، فرات جیسا بڑا دریا جس میں اس زمانے میں جہاز چلتے تھے، اس کے نواح میں کنواں کھودا جائے اور پانی نہ نکلے ؟ پھر کتاب معجم البلدان، یاقوت حموی میں صراحتاً بیان ہے کہ کربلا میں چشمے تھے۔ خود ناسخ التواریخ کے شیعہ مولف کا بیان ہے کہ حسین نے بذات خود کدال سے زمین کھودی تو آب زلال وگوار زور سے ابل پڑا، آپ نے اور ساتھیوں نے نوش کیا اور مشکیں بھر لیں (ناسخ التواریخ، صفحہ 225، مطبوعہ ایران)۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ حسین نے پھر عباس کو کہا کہ بھائی فرات پر جاؤ اور ہمارے پینے کو پانی لاؤ۔ حالاں کہ بار بار کہا جاچکا ہے کہ فرات کوسوں دور تھا لیکن ٹوکنا منع ہے، اس لیے سنتے جایئے۔ حسین نے عباس کے ساتھ کچھ لوگوں کو بھی کر دیا۔ عباس جب فرات پر پہنچے تو ابن زیاد کے آدمیوں نے دیکھ لیا اور ان پر حملہ کر دیا۔ عباس اور ان کے ساتھیوں نے متعدد لوگوں کو قتل کر دیا۔ چھ فی البدیہہ رجزیہ اشعار پڑھنے اور متعدد لوگوں کا قتل کرنے کے بعد بالآخر عباس گھاٹ تک پہنچ ہی گئے اور مشک بھر لیا۔ لیکن جب خود پینے کے لیے چلو بھرا تو انھیں حسین کی پیاس یاد آگئی، لہٰذا انھوں نے پانی پھینک دیا اور پھر تین فی البدیہہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔ راوی کہتا ہے کہ آپ جب گھاٹ کے کنارے پر چڑھے تو چاروں طرف سے آپ پر تیر برسنے لگے، یہاں تک کہ آپ کی زرہ خار پشت کی طرح ہوگئی۔ پھر آپ پر ابرص شیبان نے حملہ کیا اور داہنا ہاتھ کاٹ دیا جو مع تلوار کے اُڑ گیا۔ آپ نے تلوار بائیں ہاتھ سے پکڑلی اور ان لوگوں پر حملہ کر دیا، لیکن زبان پر اللہ کے ذکر کی بجائے رجزیہ اشعار جاری رہے۔ مشک آپ کی پشت پر لدی ہوئی تھی۔ ابن سعد نے یہ دیکھا تو کہا بدبختو! اس مشک کو تیروں سے چھید دو۔ بخدا اگر حسین نے پانی پی لیا تو تم میں سے ایک ایک کو فنا کر دیں گے۔ راوی کہتا ہے کہ انھوں نے عباس پر بہت سخت حملہ کیا لیکن انھوں نے

(یعنی عباس نے)180 مار دیے۔ اتنے عبداللہ بن یزید شیبائی نے ان کا بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا تو انھوں نے تلوار منھ میں پکڑ کر ان پر حملہ کر دیا اور رجز پڑھتے جاتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ آپ بے جگری سے لڑتے رہے۔ اتنے میں ان میں سے کسی نے آپ کو لوہے کا گرز مارا جس سے آپ کا سر پھٹ گیا اور زمین پر گر پڑے، خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ آپ نے زور سے آواز دی، اے ابو عبداللہ! آپ کو میری رخصتی کا سلام پہنچے۔ حسین نے جو آواز سنی تو زور سے چلائے؛ ہائے میرا بھائی، ہائے عباس، ہائے میرا جان جاں۔ پھر آپ نے ان لوگوں پر حملہ کرکے ان کو منتشر کر دیا۔ گھوڑے سے اترے اور انھیں اس کی پیٹھ پر لاد لیا۔ پھر انھیں لیے ہوئے اپنے خیمے میں آئے اور زمین پر لٹا دیا۔ آپ ان پر اس شدت سے روئے کہ آس پاس بیٹھے ہوئے سب لوگ رونے لگے۔ پھر حسین نے فرمایا کہ بھائی خدا تعالیٰ تمھیں ہر طرف سے جزائے خیر دے، تم نے خدا کی راہ میں جہاد کا حق ادا کر دیا ہے۔

تو یہ ہے افسانہ نویسی کا وہ شاہکار لیکن افسوس اس میں بہت سارے جھول ہیں۔ مثلاً بیان میں کہا جارہا ہے کہ زرہ تیروں سے خارپشت کی طرح ہوگئی لیکن پیٹھ پر جو مشک تھی، اس میں ایک تیر بھی نہ لگا، حتیٰ کہ ابن سعد کو مشک چھیدنے کا حکم دینا پڑا۔ داہنا ہاتھ کٹ کر گرا تو بائیں ہاتھ نے جھپٹ کر تلوار پکڑ لی۔ پھر بایاں ہاتھ بھی کٹ کر گرا تو تلوار منھ میں کیسے پہنچ گئی اور یہ کس طرح ممکن ہوا کہ منھ میں تلوار پکڑ کر عباس قتال کر سکیں؟ ایسے کرتب باز تو میں نے جیمنی سرکس تک میں نہیں دیکھے۔ لیکن سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس افسانہ کی بنیاد (theme) ہی اتنی کمزور ہے کہ اس بھاری بھرکم افسانہ کا بوجھ سنبھالنے سے قاصر ہے۔ پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ کربلا میں متعدد چشمے موجود تھے، پھر یہ بھی یاد رکھیں کہ کربلا ایک ساحلی علاقہ تھا جس میں کنواں کھودنے پر پانی نہ نکلنا قطعی جھوٹی بات ہے، تیسری اور آخری بات یہ کہ خود شیعہ مولف نے اپنی کتاب میں اس کی گواہی دے دی کہ تھوڑی سی زمین کھودنے سے آب زلال حسین نے نکال لیا تھا؛ چنانچہ اب عباس کا پانی کے حصول کے لیے جانا اور اس طرح کی معرکہ آرائی ساری کی ساری کہانی اوندھے منھ گر پڑتی ہے۔ یہ افسانہ من گھڑت محض ہے جسے صرف جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

حسین کا عباس کی لاش پر رونا اور یہ کہنا کہ تم نے خدا کی راہ میں جہاد کا حق ادا کر دیا، مضحکہ خیز ہے، چونکہ ابھی ابھی تو تھوڑی دیر پہلے آپ یزید کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہ رہے تھے اور یزیدی فوجوں کے سامنے گڑگڑا رہے تھے اور زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے، پھر جہاد کیسا؟

بہر حال، ابو مخنف اور اس کی طرح دیگر راویوں کے مطابق، کربلا میں عباس وہ پہلے شخص تھے جو حسین کی ہٹ دھرمی اور سیاسی خود غرضی کی قربان گاہ میں بھینٹ چڑھ گئے۔

.

صبح سے سہ پہر تک

حسین کی دہائی

عباس کی شہادت کے بعد ایک بار پھر تقریری سلسلہ شروع ہو گیا۔ حسین نے پھر دشمنوں کے سامنے اپنی نسبی عظمت کی دہائیں دینی شروع کر دیں:

"لوگو، یاد رکھو یہ دنیا جائے فنا و زوال ہے۔ اس میں بسنے والوں کا حال کبھی کچھ ہوتا ہے تو کبھی کچھ۔ لوگو شریعت کے سب احکام تمھارے جانے پہچانے ہیں۔ تم نے قرآن پڑھا ہے اور تم جانتے ہو کہ محمد جبار کی طرف سے پیامبر ہیں۔ اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم ان کی فرزند کو ظلم و تعدی سے قتل کرنا چاہتے ہو۔ لوگو! تم فرات کا پانی دیکھ رہے ہو، اس کی موجیں ایسی ہیں جیسے مہیب مچھلیوں کے پیٹ۔ یہودی، نصرانی اور کتے اور خنزیر اس کا پانی پیتے ہیں اور پیاس سے مر رہی ہے تو رسول اللہ کی اولاد۔"

فرات کا پانی

جب فرات وہاں سے کوسوں دور تھا تو حسین بیچارے یہ کیسے کہتے کہ "تم فرات کا پانی دیکھ رہے ہو"؟ افسانہ کربلا کا ایک اہم جزو قافلہ حسینی پر پانی کی بندش ہے، لہٰذا اسے بار بار دہرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ 7 محرم سے ابن زیاد کے حکم پر یہ بندش لگائی گئی۔ حالاں کہ اسی یوم عاشورہ کی روایتوں میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حسین اور ان کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے غسل کیا اور ایک بڑے برتن میں مشک گھول کر تیار کیا گیا تھا جو ان حضرات نے اپنے اپنے جسم پر لگایا۔ اس کے علاوہ ان روایتوں نے کربلا کے حوالے سے جو یہ تاثر عام کیا ہے کہ وہ ایک بے آب و گیاہ ریگستان تھا، اس کی تردید کے لیے محمد الباقر کی وہ روایت کافی ہے جو پچھلے

ابواب میں نقل کی جاچکی ہے اور جس کے مطابق کربلا ایک ایسی زمین تھی جس میں نرکل اور بانس کا جنگل یا جھاڑیاں موجود تھیں اور ظاہر ہے یہ خشک ریگستان میں نہیں ہوا کرتیں۔ ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں پانی زمین کی سطح سے اتنا قریب تھا کہ تھوڑی سی زمین کھودو اور پانی باہر۔ معجم البلدان میں کربلا کے بارے میں صراحت ہے کہ یہاں کی زمین میں نرمی (رخوۃ) ہے۔ گذشتہ ابواب میں ہم کچھ اور حوالے بھی اس بابت پیش کرچکے ہیں جنھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال یہ ایک خالص پروپیگنڈہ ہے کہ کربلا میں پانی نایاب یا کمیاب تھا۔ اس پروپیگنڈہ کے ڈھول کا پول یوں بھی کھل جاتا ہے کہ مسلح انسانوں پر جن میں 30-32 سوار بھی تھے، مسلسل تین دن تک پانی کی مکمل بندش ممکن نہیں۔ البتہ اگر یہ بات کہی جائے کہ جو قریبی گھاٹ تھا، اس پر پابندی عائد کی گئی تھی تاکہ حسینی قافلہ بہ سہولت پانی نہ لے سکے تو بات سمجھ میں آنے والی بھی ہے لیکن پورے دریا پر روک ممکن نہیں ہو سکتی۔

عمر بن سعد کا نرم رویہ

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کی توجہ ایک خاص نکتہ کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو مبارز طلبی شروع ہو جاتی ہے یعنی ایک صف سے ایک سورما نکل کر پکارتا ہے کہ کوئی اس کے مقابلے کو آئے، اس طرح دونوں صفوں سے ایک ایک آدمی نکل کر لڑتا ہے۔ غور کیجیے کہ ابن زیاد کی ساری تنبیہات کے خلاف عمر بن سعد، حسین اور ان کے ساتھیوں کو تقریریں کرنے کا موقع دے کر اپنے ہی کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کا کافی موقع دے چکا تھا۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ حسینی قافلہ پر بھرپور یلغار کرکے یکبارگی قصہ ختم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا، جو اس کے لیے کافی آسان تھا لیکن اس کی بجائے حسینی قافلہ کی قلت تعداد کی بنا پر وہ انھیں مبارز طلبی کا موقع دیتا ہے جو ظاہر ہے حسین کے حق میں جاتی تھی، گویا ابن سعد یہاں بھی حسین کی معاونت ہی کررہا تھا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر ایسا لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا، چونکہ اول تو شمر جو ابن زیاد کی طرف سے ابن سعد پر مسلط کیا گیا تھا، وہ کیوں اس کی سست روی اور بے عملی پر سرزنش کرتا نظر نہیں آتا؟ بر سبیل تذکرہ یہاں بتادیا جائے کہ شمر کا نام جنگ صفین میں بھی ملتا ہے اور وہ وہاں علی کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے، اب یہاں اس کی "حسین دشمنی" عجیب ہے۔ بہرحال، ابن زیاد کے سخت احکام اور شمر جیسے "دشمن" کو تعمیل احکام کے لیے عمرو بن سعد پر

مسلط کیے جانے کی روایتیں اس دعویٰ کو رد کرتی نظر آتی ہیں کہ کربلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ چلا ہو گا۔ یہی روایتیں اور ابن سعد کے لشکر کی تعداد (جو ابو مخنف کے مطابق 80 ہزار اور دیگر شیعہ ماخذ کے مطابق کم سے کم تیس چالیس ہزار) اس بات کو ناقابل اعتبار بناتی ہیں کہ قافلہ حسینی کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنے کا موقع دیا گیا ہو گا۔ یوں بھی یہ معاملہ کسی جنگ کا تھا ہی نہیں بلکہ صرف مزاحمت اور مزاحمت کو توڑنے کا معاملہ تھا۔ چنانچہ ابن سعد کی حسین سے قرابت اور ہمدردی اور دوسری طرف اپنے امیر ابن زیاد کی تابعداری؛ دونوں کو ساتھ ساتھ قائم کرنے کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ ابن سعد کے لشکر کی کوشش حسینی قافلہ کو گھیر کر اور بے قابو کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ surrender کر لینے کی ہوتی۔ لیکن اس کوشش میں ظاہر ہے کہ دوسری طرف سے یعنی حسین کی جانب سے شدید مزاحمت کی جانی چاہیے، لہٰذا اس مزاحمت کے نتیجے کے طور پر وہ قربان ہو جاتے۔

ایک اور روایت بھی اس کے مقابل میں یوں پائی جاتی ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص یعنی زحر بن قیس کو حسین کا سر لے کر یزید کے پاس بھیجا تھا، اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کہا:

"امیر المومنین مژدہ ہو، اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کا۔ حسین بن علی اپنے اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (اس خبر پر) ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے پر چھوڑ دیں ورنہ قتال کے لیے تیار ہوں۔ ان لوگوں نے قتال پسند کیا۔ نتیجہ میں ہم لوگوں نے سورج نکلتے ہی ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا، حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کو کھوپڑیوں پر کام شروع کیا تو جدھر منھ اٹھا بھاگ پڑے، کہیں ٹیلوں کی، کہیں گڑھوں کی پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ پس اے امیر المومنین قسم ہے خدا کی ہمیں ان کا خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ وقت نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 264)

صبح سے سہ پہر تک کی ناقابل اعتبار روایتوں کے دامن پر بہت سی کہانیاں ٹانک دی گئی ہیں۔ انھی کہانیوں میں اہل بیت کی لاشوں کا ایک کے بعد ایک کر کے خاک و خون میں تڑپنا، حسین کا ان کے پاس دوڑ دوڑ کر جانا، رنج والم کے کلمات سے انھیں الوداع کرنا، زینب کبریٰ کا روتے تڑپتے بار بار میدان جنگ میں نکل آنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری

کہانیاں، جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو خود حسین کی الوالعزمی اور استقامت کو داغدار کرتی ہیں۔ بہر حال، آیئے یوم عاشورہ کی وہ کہانیاں دیکھیں جو دامان اہل بیت کے لیے ننگ ہونے چاہئیں تھے لیکن افسوس بعد کی نسلوں نے اسے تمغہ مظلومیت بنا کر اپنی نسبی عظمت پر چار چاند لگانے کی مذموم کوشش کی جو اب تک جاری ہے۔

آل بیت کے دامن پر بدنما داغ

اہل بیت کے دامن کو داغدار کرنے کے لیے قبل از جنگ حسین کی وہ تقریر ہی کافی ہے جو گذشتہ باب میں نقل ہو چکی ہے۔ علی مرتضیٰ شیر خدا کا بیٹا اپنے والد کے نام پر، اپنی والدہ خاتون جنت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیا کے نام پر، اپنے چچا جعفر طیار کے نام پر اور اپنے نانا کے چچا سید الشہدا حمزہ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے ؟ اور ایک بار نہیں، عنوان بدل بدل کر بار بار مانگے ؟ اس سے بڑی ذلت کی بات بھلا اہل بیت کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے ؟

پھر ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور دامن حسین پر دوسرا بڑا دھبہ ملاحظہ کیجیے۔ حسین اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو، اپنے رفقا کو، حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی ("شہید انسانیت" کے شیعہ مصنف نے تصریح کی ہے کہ قاسم بن حسن بالغ نہیں ہوئے تھے) اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوائے ایک بیمار اور صاحب فراش صاجزادے علی بن حسین (زین العابدین) کے اور کوئی نہ بچا، تب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اول تو کوئی شخص جو اگر مجبور و معذور نہ ہو تو اپنے بچوں کو ہلاکت کے لیے آگے نہیں بڑھاتا یا کم از کم انھیں اکیلا نہیں چھوڑتا۔ لیکن یہاں تو روایتیں ہمیں باور کرا رہی ہیں کہ نہ صرف اپنے کمسن صاجزادے علی اکبر (19-20 سال) کو اکیلا آگے بڑھنے دیا اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے اسے اکیلا ہی آخری دم تک لڑنے بھی دیا، بلکہ بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کو ایک ایک کر کے میدان کارزار میں خاک و خون میں لوٹتے دیکھتے بھی رہے۔ کوئی مجھے بتائے کہ ایسے خود غرض اور شقی القلب شخص کے لیے میں اپنے دل میں کیسے عقیدت پیدا کروں اور ایک صاحب اولاد ہونے کی حیثیت سے اس شدید احساس کی چبھن سے خود کو بچاؤں ؟

لیکن وہ مسلمان ہی کیا جو ہر بے جابات کی تاویل نہ پیش کرے، اس میں تو ہر مسلمان نے ماسٹر ڈگری حاصل کی ہوئی ہے، لہٰذا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس نکتہ کی کوئی تاویل پیش نہ کی گئی ہو، چنانچہ "شہید انسانیت" کے مؤلف علی نقی اس کی تاویل یوں پیش کرتے ہیں:

"حسین کے لیے نسبتاً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ہدیہ راہ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایت حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔

"اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وقیع نہیں سمجھی جا سکتی تھی جتنی بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی کہ آپ دین حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لیے اس منزل سے گذر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اسی باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں اور نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستان مادر سے مانوس ہوتا ہے...... مگر حسین کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے، وہ اس لیے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے، اپنی موجودگی میں راہ حق پر نثار کر دیا...... حسین کا کمال عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں۔ اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام دشوار گذار مراحل کو طے نہ کر لیا، اس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا۔"(شہید انسانیت، صفحہ 513-514)

یہ خطیبانہ فلسفہ ایک فاضل اور نامی گرامی شیعہ عالم کی ذہانت اور ریاضت کا ثمرہ ہے جس میں اس سنجیدہ سوال کا جواب نہیں ملتا جو ایک باپ اور سرپرست کی عظمت کو داغدار کر رہا ہے۔ البتہ موصوف کی اس تاویل سے ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا حسین کی شان عیسیٰ سے بھی بالاتر تھی؟ اس کا ایماندارانہ جواب وہی لوگ دے سکتے ہیں جو اپنا ایمان اور اپنی غیرت حسین کی اختراعی مظلومیت پر نچھاور کرنے کو تیار نہ ہوں۔ دور کیوں جایئے، محمد باقر کی روایت ہی لے لیجیے، جس میں واقعہ کربلا کو بغیر نمک مرچ لگائے سادہ لفظوں میں یوں پیش کر دیا گیا ہے کہ:

"پس (جب آپ نے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کی شرط پوری کرنے سے انکار کیا تو) عمر بن سعد نے آپ سے قتال کیا۔ اس میں آپ کے تمام اصحاب شہید ہو گئے جن میں آپ کے اپنے گھر کے قریباً 15-20 جوان بھی تھے۔ بعد ازاں آپ نے خود قتال کیا اور آپ بھی شہید ہوئے۔" (البدایہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 189)

قصوں کا مینا بازار

ظاہر ہے محمد باقر کے اس سادہ بیان سے ماتم کے کاروبار میں رونق لگنی نہیں تھی۔ اس روایت میں ایک کے بعد ایک لاشہ گرنے کا منظر بھی نہیں آتا جو ابو مخنف اور مجلس عزا کے ذاکرین میں نظر آتا ہے۔ ان لاشوں پر حسین کا دوڑ کر جانا اور زینب سر کھولے، سینہ پیٹتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی بھی نظر نہیں آتیں، لاشوں سے لپٹ کر بین کرتی بھی نہیں پائی جاتیں۔ اس روایت میں پیاس کی شدت سے حسین فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اتارنے جا رہے ہیں تو گلے میں دشمن کا تیر ترازو ہو جانا، پھر دشمنوں کو یہ بد دعا دینا کہ "اے اللہ! ان کو گن لے اور پھر انھیں چن چن کر مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ"؛ وغیرہ جیسی کہانیاں نہیں ملتیں۔ اس سادہ بیانی میں وہ رجزیہ کلمات بھی نظر نہیں آتے جو ہر شہ سوار پڑھتا ہوا تلواریں لہراتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوتا ہے اور کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے۔ میں اس داستان گوئی کو ایک جھلک، محض ایک جھلک نہایت اختصار سے بیان کر دیتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس واقعہ کے پہلے راوی نے افسانہ طرازی کی یہ بنیاد کس طرح رکھی تھی جس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا اور اب تو ہمارے عہد میں ہزاروں ابو مخنف نظر آتے ہیں جو اپنے غیر مرئی ویڈیو کیمرہ سے میدان کربلا کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں جیسے ابھی ابھی اس کی فرسٹ کاپی لے کر لیبارٹری سے لوٹے ہوں۔ ان طفیلیوں کو چھوڑیے، ہم نموناً ابو مخنف کے بلیو پرنٹ کے کچھ نمونے بطور تفنن طبع دیکھ لیتے ہیں:

- ابو مخنف کے مطابق، جب حسین تقریریں کر کر کے اور دہائیں دے دے کر بے حال ہو گئے اور اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو آپ نے بچوں اور خواتین کو خیموں میں بھیج دیا اور اس کے گرد خندق کھود کر لکڑیاں بھر دیں اور آگ لگا دی، تاکہ جنگ کا رخ ایک ہی طرف رہے۔

راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد کے لشکر سے ایک سوار نکلا اور خندق کے مقابل کھڑے ہو کر اس نے پکارا؛ اے حسین! آخرت کی آگ سے پہلے ہی دنیا میں آگ کی جلدی کر لی؟ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ جبیرہ بن کلبی ہے۔ حسین نے اسے بد دعا دی کہ خدایا! اسے آخرت سے پہلے ہی دنیا میں جلا ڈال۔ ابھی آپ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ جبیرہ بن کلبی کا گھوڑا لف ہو گیا اور اسے خندق میں گرا دیا۔ اس پر حسین کے ساتھیوں نے تکبیر کی۔ اچانک آسمان سے ہاتف کی آواز آئی؛ رسول اللہ کے فرزند مبارک ہو یہ قبولیت۔
حیرت ہے کہ جب حسین کی بد دعا اتنی اثر انداز تھی تو انھوں نے پورے یزیدی لشکر پر کیوں نہ آزمایا؟ کیوں خواہ مخواہ آپ دشمنوں کے لشکر کے سامنے جان کی امان پانے کے لیے گڑگڑاتے رہے، یزید کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کی دہائی دیتے رہے، کیا اللہ تعالیٰ کا یہ آفر صرف جبیرہ بن کلبی تک محدود تھا؟

- سعد نے حکم دیا کہ خیموں کو آگ لگا دی جائے۔ حسین نے فرمایا؛ انھیں جانے دو یہ تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ راوی کہتا ہے کہ شمر نے دھاوا بولا تا آنکہ حسین کے خیمے پر برچھا مارا اور آواز لگائی آگ لاؤ کہ میں ان ظالموں کے گھر جلا ڈالوں۔ حسین کے ساتھیوں نے اس پر حملہ کر کے اسے خیمہ سے ہٹا دیا۔
اگر خیموں کے گرد آگ کی خندق تھی تو شمر وہاں کیسے پہنچا؟ پھر اس نے اس خیمہ کو جلانے کے لیے کیسے ارادہ کیا جن میں دیگر خواتین کے ساتھ اس کی اپنی رشتہ کی بہن ام البنین زوجہ علی والدین عباس بن علی بھی موجود تھیں؟ شمر تو علی کے رشتے کے سالے عباس کے حقیقی اور حسین کے سوتیلے ماموں تھے، وہ علی کی فوج کے ایک دستے کے افسر بھی تھے جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے۔
دلچسپ بات یہ کہ ابو مخنف کہتا ہے کہ حسین نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا؛ خدایا! تیرے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تو شمر کو آگ میں جلا دے۔ لیکن افسوس اس بار اللہ نے حسین کی بد دعا رد کر دی اور جبیرہ بن کلبی کی طرح شمر کو آگ میں نہیں جلایا۔

- داستان میں زور بیان پیدا کرنے کے لیے ہر سوار کو فی البدیہہ شاعر بنا دیا گیا ہے جو رجزیہ کلمات پڑھتا ہوا دشمنوں پر حملہ آور ہوتا ہے، کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم میدان کارزار میں نہیں کسی محفل

مشاعرہ میں شریک ہیں۔ اس محفل مشاعرہ میں شریک سورما شعرا کے رجزیہ اشعار اور ان کے مقتولین کی تعداد حسب ذیل ہیں:

1. حبیب بن مظاہر: 4 اشعار پڑھے اور 35 سوار مار گرائے۔
2. زہیر بن قین: 6 اشعار پڑھے اور 120 سواروں کو قتل کیا۔
3. یزید بن مظاہر اسدی: 3 اشعار پڑھے اور 50 سوار مار گرائے۔
4. یحییٰ بن کثیر انصاری: 5 اشعار پڑھے اور 50 سواروں کو قتل کیا۔
5. ہلال بن نافع: 3 اشعار پڑھے اور 70 سواروں کو قتل کیا۔
6. ابراہیم الحسن: 3 اشعار پڑھے اور 50 سواروں کو مار گرایا۔
7. علی بن مظاہر اسدی: 2 اشعار پڑھے اور 70 سواروں کو قتل کیا۔
8. معلا: 3 اشعار پڑھے اور 50 سواروں کو قتل کیا۔
9. جون (ابوذر غفاری کے آزاد کردہ غلام): 2 اشعار پڑھے اور 70 سواروں کو قتل کیا۔
10. عمیر بن مطاع: 3 اشعار پڑھے اور 30 سواروں کو مار گرایا۔
11. وہ لڑکا جو راستے میں حسین کے ہاتھوں پر اسلام لایا تھا: 3 اشعار پڑھے اور 40 سواروں کو قتل کیا۔
12. طرماح: 3 اشعار پڑھے اور 70 سوار مار گرائے۔
13. عبداللہ بن مسلم بن عقیل: 4 اشعار اور 90 سواروں کو قتل کیا۔
14. عون بن جعفر: 3 اشعار پڑھے اور 80 سواروں کو قتل کیا۔
15. جابر بن عروہ غفاری: 3 اشعار پڑھے اور 80 سواروں کو قتل کیا۔
16. سالک بن داؤد: 2 اشعار پڑھے اور 60 سواروں کو قتل کیا۔
17. موسیٰ بن عقیل: 3 اشعار پڑھے اور 70 سواروں کو قتل کیا۔
18. احمد بن محمد ہاشمی: 2 اشعار پڑھے اور 80 سواروں کو مار گرایا۔

19. فرزند حُربن یزید: بغیر اشعار پڑھے 70 سوار مار گرائے۔

20. حُربن یزید ریاحی: 15 اشعار پڑھے اور 186 سواروں کو قتل کیا۔

21. قاسم بن حسن: بغیر اشعار پڑھے، 70 سوار مار گرائے۔

22. احمد بن حسن: 4 اشعار پڑھے اور 190 سوار مار گرائے۔

23. علی اکبر: 2 اشعار پڑھے اور 180 سوار مار گرائے۔

24. عباس بن علی: 15 اشعار پڑھے اور 180 سوار مار گرائے۔

25. حسین بن علی: 67 اشعار پڑھے اور 1500 سواروں کو قتل کیا۔

سوال اٹھتا ہے کہ راوی کو مقتولوں کی تعداد کیسے یاد ہے؟ کیا وہ وہاں calculator یا بنیوں کا کھاتہ لیے بیٹھا تھا اور اندراج کرتا جارہا تھا؟ ساری تعداد اس معیار پر قرار دی گئی ہے جو راوی کے نزدیک مارنے والے کے درجے کے مطابق ہو۔ سب سے زیادہ مقتول حسین کے ہاتھ سے ہوئے یعنی 1500، گویا حسین کے مقابلے میں جو تھے وہ عرب نہیں تھے؟ حالاں کہ تاریخ اسلام میں مندرج یہ وہی لوگ تو تھے جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے، لیکن میدان کربلا میں سب نہتے کھڑے نظر آتے ہیں، جو چپ چاپ گاجر مولی کی طرح کٹتے چلے گئے۔ تاریخ سے جو بات ثابت ہے، وہ صرف اتنی ہے کہ 70 آدمی حسین کی طرف مقتول ہوئے اور تقریباً اسی کے قریب سرکاری فوج کی طرف مقتول ہوئے۔ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ جنگ نہیں تھی جو یوں رن پڑتا۔ حسین کے ساتھیوں نے اچانک حملہ کر دیا اور یوں سرکاری فوج کے سپاہی مدافعت پر مجبور ہوگئے، اس لیے ان کے مقتول کچھ زیادہ رہے، کیوں کہ وہ گفت وشنید کے لیے آئے تھے، نہ کہ جنگ کرنے کے لیے۔

کچھ مزید کہانیاں اور قتل حسین

ابو مخنف کے میدان کربلا میں وقوع پذیر نام نہاد جنگ کی تصویر کشی میں سارے رنگ موجود ہیں، سوائے ایک سچ کے رنگ کے۔ ابو مخنف کا یہ "تصویری البم" کافی ضخیم ہے جس میں منظر کشی، فریقین کے مکالمے، آہ وزاری، تلواروں کی جھنکار، دشمن کی پھنکار، رجزیہ کلمات کی چہکار؛ سارے مسالے موجود ہیں۔ ہم ان پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے، لہٰذا اس اسکرپٹ کے ان کچھ چنندہ مناظر (scenes) تک خود کو محدود رکھیں گے جن میں زبردست جھول موجود ہے۔ مثلاً:

- ابو مخنف کہتا ہے کہ یحیٰ بن کثیر انصاری نام کا کوئی شخص بھی حسین کی جانب موجود تھا، جب کہ حسین کے ساتھیوں میں کوئی انصاری موجود نہ تھا، آپ مکہ سے سیدھا کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو مدینہ کا کوئی انصاری آپ کا ساتھ دینے وہاں کیسے پہنچ جاتا؟ یہ نام محض خیالی اور فرضی ہے۔
- اسی یحیٰ بن کثیر انصاری سے ابو مخنف نے جو رجزیہ کلمات کہلوائے ہیں، اس کے ایک شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے؛ "انھوں نے حسین سے خیانت کیوں کی؟ اور یوں حادثے ایک ساتھ آگئے اور وہ لوگ یزید سے راضی ہوگئے، حالاں کہ یہ رضا جہنم میں ڈالنے والی ہے۔" ملاحظہ فرمائیں کہ کس دھڑلے سے راوی نے تمام امت مسلمہ حتیٰ کہ مقتدر صحابہ اور تابعین کو جہنمی کہہ ڈالا جو یزید کی خلافت پر متفق تھے۔
- ابراہیم بن الحسین جب حسین کی طرف سے لڑنے نکلے تو ان کے منھ سے بھی رجزیہ کلمات جاری تھے، جس کے ایک شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے؛ "اے حسین خاطر جمع رکھیے، آج آپ احمد (رسول اللہ) سے ملیں گے، پھر اپنے والد سے جو پاک تھے اور جنھیں نصرت الٰہی حاصل تھی۔" علی کو جیسی نصرت الٰہی ملی تھی، وہ دنیا

خوب اچھی طرح جانتی ہے۔ جب سے خلافت ملی، ایک دن بھی چین نصیب نہ ہوا، حتیٰ کہ اپنے ہی گروہ کے ایک باغی کے ہاتھوں مقتول ہوئے۔ پھر ان کی اولاد میں سے بھی جو شخص حصول خلافت کے لیے کھڑا ہوا، ناکام رہا۔

- ابو مخنف کہتا ہے کہ پھر عبد اللہ بن مسلم بن عقیل نکلے، دشمنوں پر حملہ کیا اور 90 سواروں کو قتل کر ڈالا۔ پھر ایک ملعون نے آپ کی ہنسلی پر ایک تیر مارا جس سے آپ گھوڑے سے گر پڑے اور گرتے گرتے چلائے: "ہائے ابا، میری کمر ٹوٹی۔" 90 سواروں کو قتل کرنے والا سورما ایک تیر لگنے سے "ہائے ابا اور ہائے اماں" کرنے لگا، حیرت ہے۔ مسلم بن عقیل کے یہ بیٹے نو عمر تھے مگر چونکہ نسباً ہاشمی تھے، اس لیے راوی نے ان کے ہاتھوں سے 90 لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کٹوا دیا۔

- ابو مخنف کہتا ہے کہ پھر عون بن عبد اللہ جعفر دشمنوں پر حملہ آور ہوئے۔ کافی پہلے کہا جا چکا ہے کہ عبد اللہ بن جعفر کا کوئی فرزند جو زینب کے بطن سے ہو، کربلا میں موجود نہ تھا۔ یہ عون اور محمد عبد اللہ بن جعفر کے حقیقی بھائیوں کے ہم نام تھے جو ان کی دوسری بیویوں بن المسیب اور حفظہ کے بطن سے تھے۔ جب حسین کوفہ کی جانب روانہ ہوگئے تو عبد اللہ بن جعفر نے امیر مدینہ سے فرمان لکھوا کر اپنے انھی بیٹوں کو انھیں واپس لانے بھیجا تھا جس میں وہ ناکام رہے اور خالی ہاتھ باپ کے پاس لوٹ گئے۔ (اس کا ذکر پہلے تفصیلاً آ چکا ہے)

- ابو مخنف کہتا ہے کہ جابر بن عروہ غفاری جو بہت معمر تھے، دشمنوں پر حملہ آور ہوئے، یہ رسول اللہ کے ساتھ غزوہ بدر اور دوسرے غزوات میں شریک تھے۔ یہ نام بھی فرضی ہے، کیوں کہ یہ نام اصحاب غزوہ بدر میں ملنا تو در کنار، صحابہ کی فہرست میں بھی کہیں نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حسین کا ساتھ کسی صحابی رسول نے نہیں دیا تھا اور چھوٹے بڑے ہر شخص نے انھیں سمجھایا کہ وہ ایسا غلط قدم نہ اٹھائیں۔

- ابو مخنف کے مطابق، موسیٰ بن عقیل رجز یہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے، ایک شعر کا مفہوم سن لیجیے، "میں جوانوں اور خاتونوں کی حمایت پر ہوں، اس امام کی (حمایت پر) جو سب جنوں اور انسانوں کا امام ہے۔" امامت کا یہ تصور پہلی صدی ہجری کے آخر تک نہیں پایا جاتا۔ اس ایجاد کا سہرا محمد بن جعفر پر ہے جسے شیطان الطاق کہتے تھے۔ چنانچہ امام ابن حزم نے "الفضل" میں لکھا ہے کہ زین بن علی زین العابدین اور جعفر صادق دونوں اس کی ایجاد پر ناراض تھے اور علانیہ اس کی تردید کی تھی (ملاحظہ ہو: الفضل، جلد 4، صفحہ 181، منقول از الواصم من القواصم)۔ اس سے پہلے عام مسلمانوں کے نزدیک امام کا مطلب تھا سربراہ مملکت یعنی یہ محض ایک لقب تھا جسے سب سے پہلے محمد الامام بن علی بن عبد اللہ بن عباس نے اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ جن و انس کا امام ہونا یا اسے کوئی اعلیٰ درجہ سمجھنا اور خلافت ظاہری اور باطنی کا تصور پیدا کرنا مسلمانوں میں معروف نہ تھا۔ حدیث و فقہ کی تمام کتابوں میں امامت سے مراد امت کی سیاسی سربراہی ہے۔

- ابو مخنف نے میدان کربلا کے ایک حسینی سورما کا نام احمد بن محمد ہاشمی بتایا ہے جو کہ ایک فرضی نام ہے، اس نام کا کوئی شخص ہاشمی خاندان کا اس زمانہ میں نہ تھا۔

- ابو مخنف کہتا ہے کہ امام اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگے لیکن اپنے ساتھیوں اور مددگاروں میں جسے دیکھا، وہ یا تو قتل ہو چکا تھا یا گر پڑا تھا اور زخمی تھا۔ پھر آپ نے آواز لگائی "کیا کوئی فریاد کو پہنچنے والا نہیں جو ہماری فریاد کو پہنچے۔ کیا کوئی پناہ دینے والا نہیں جو ہمیں پناہ دے، کیا کوئی مدد کرنے والا نہیں جو ہماری مدد کرے (الخ)۔" کیا یہ اسی حسین کی فریاد تھی جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کی قربانی دے کر اسلام کو زندہ کیا ہے؟ پھر باطل کے سامنے فریاد و واویلا کیسا؟ یہ بیوہ عورتوں کی طرح دہائیاں کیسی؟ کیا حسین مظلوم تھے؟ کیا ان کے خروج کے خلاف ایکشن لینا ظلم کے مترادف تھا؟ ہرگز نہیں۔ ذرا پلٹ کر دیکھیں، کیا علی نے ام المومنین عائشہ کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی تھی، جب کہ وہ ساری امت کی ماں ہیں؟ تو اگر حسین اپنے موقف اور ضد پر اڑے تھے تو ان کے اقدام خروج کا مقابلہ حکومت کے لیے کیوں کرنا جائز کہلائے گا؟ جب ام المومنین کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی تو حسین کس شمار و قطار

میں ہیں؟ خود اس کی تائید صحیح بخاری میں موجود رسول اللہ کی ایک حدیث سے ہو جاتی ہے کہ "اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

- حُر بن یزید ریاحی کا ذکر کرتے ہوئے ابو مخنف کہتا ہے کہ وہ 15 رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے جس میں سے کم از کم ایک شعر کافی دلچسپ ہے، اس کا مفہوم ملاحظہ فرمائیں؛ "پس (اے گروہ معاندین) رک جاؤ ورنہ میں ویلمیوں سے بھی زیادہ جنگجو فوجیوں کے پرے کے پرے لا کر تمھارے خلاف ہجوم کروں گا۔" واضح رہے کہ واقعہ کربلا کے کئی سو برس بعد دیلمیوں کی جنگجوئی اور سیاسی قوت کا اظہار ہوا تھا، اور یہاں ان کی شجاعت کو مثالی کر کے دکھایا گیا ہے۔ انھی دیلمیوں نے حکومت کی سرپرستی میں شیعیت کو فروغ دیا تھا۔ ماتم حسین کی ابتدا کی اور سینہ کوبی اور ہائے ہائے کو رواج دیا۔ کربلائی قبور کے انہدام اور ڈیڑھ سو برس تک زراعت کیے جانے کے بعد یہی دیلمی سیاسی قوت کے زیر سرپرستی وہاں کی اور نجف کی زیارت گاہیں از سر نو عالیشان طرز سے شیعیت کے مرکزی مقامات کی حیثیت سے تعمیر ہوئیں۔ انھی دیلمیوں کا ذکر ان کے عالم وجود میں آنے سے دو ڈھائی سو برس پہلے حُر کی زبان سے رجزیہ اشعار میں ادا کرانے سے خود حُر بن یزید ریاحی کی شخصیت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔

- راوی کہتا ہے کہ خیمے سے دو نو خیز لڑکے نکلے، جیسے دو چاند ہوں۔ یہ تھے حسن بن علی کے فرزند؛ ایک کا نام تھا احمد اور دوسرے کا قاسم۔ لیکن افسوس، حسن کے بیٹوں میں احمد نام کا کوئی فرزند تو تھا ہی نہیں۔

- ابو مخنف کہتا ہے، پھر آپ ام کلثوم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: بہن میں تمھیں اپنے چھوٹے بیٹے کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، وہ ابھی چھ مہینے کا بچہ ہی ہے۔ انھوں نے کہا: بھائی اس بچے نے تین دن سے پانی نہیں پیا، اس کے لیے کہیں سے پانی حاصل کیجیے۔ شیعہ مورخ یعقوبی نے لکھا ہے کہ بچے کی ولادت اسی دن ہوئی تھی، نہ کہ وہ چھ ماہ کا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھیے کہ حسین اور ان کے ساتھیوں کے نورہ ملنے کے

لیے پانی موجود تھا، زینب کے بحالت غشی منھ پر چھینٹے دینے کے پانی موجود تھا مگر بچے کے حلق کو تر کرنے کے لیے ایک بوند بھی نہ تھی۔ یہ روایتیں ہیجان جذبات کے لیے گڑھی گئی ہیں۔

- راوی کہتا ہے کہ پھر حسین دشمن کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک بار پھر تقریر شروع کر دی۔ دشمن کا ایک جملہ قابل غور ہے:" بدر و حنین میں تمھارے باپ نے ہمارے بزرگوں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کے سبب ہمیں ان سے عداوت ہے اور اس عداوت کی بنا پر ہم تمھیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔" کیا کہنے ہیں جناب۔ بدر و حنین میں کون سا کوفی مارا گیا تھا؟ بدر کی جنگ تو قریش سے تھی۔ معاویہ کے ماموں ابو حذیفہ اور ابن سعد کے والد سعد نے رسول اللہ کے جھنڈے کے نیچے اپنی اقوام کا قتل کیا تھا اور مارے جانے والوں میں جہاں معاویہ کا نانا عتبہ اور بڑا بھائی حنظلہ تھا، وہیں علی کا بڑا بھائی طالب بھی تھا۔ قید ہونے والوں میں رسول اللہ اور علی کے چچا عباس اور بھائی عقیل بھی تھے اور ابن عم نوفل بھی۔ تو اس کا صدمہ ان کوفیوں کو کیوں کر ہوا؟ حنین کی جنگ ہوازن سے تھی، وہاں کوئی کوفی کیسے پہنچ گیا؟ حالاں کہ کوفہ کی بنیاد بھی اس وقت نہیں پڑی تھی۔

- پھر حسین رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے جس کے ایک شعر کا مفہوم ملاحظہ ہو؛"یعنی علی پر جو نبی کے بعد سب سے زیادہ پاک ہیں اور وہ نبی جو ماں باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی ہیں۔" یہ علم الانساب میں نیا انکشاف ہے کہ رسول اللہ ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی تھے۔ دراصل ابو مخنف پر نسبی فضیلت اس طرح حاوی ہے کہ وہ حسین کی کوئی اور فضیلت دکھانے سے قاصر ہے، گویا ہاشمیت بھی کوئی فضیلت ہو۔

- پھر حسین ایک اور شعر میں فرماتے ہیں کہ علی رسول اللہ کے ساتھ پورے سات دن ایسے رہے کہ روئے زمین پر اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی عبادت گذار نہ تھا۔ گویا ام المومنین خدیجہ کا بھی انکار ہے؟

- راوی کہتا ہے کہ پھر آپ یعنی حسین نے ان گم کردہ راہ لوگوں پر حملہ کیا جن پر خدا کی لعنت ہو، انھیں گھاٹ سے ہٹا دیا۔ پھر فرات کے کنارے گھوڑے سے اترے۔ آپ کا گھوڑا بھی پیاسا تھا، اس نے جب پانی کی ٹھنڈک محسوس کی تو اپنا منھ اس میں ڈال دیا۔ آپ نے گوارہ نہ کیا کہ اس کے پینے کی راہ میں حائل ہوں اور گھوڑے کے پانی پینے تک صبر کیا۔ پھر آپ نے پینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک آواز آئی: حسین عورتوں کے خیمے کا خیال کرو، اس کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ تو آپ نے چلو سے پانی پھینک دیا اور خیمے کی طرف گئے، وہاں جا کر دیکھا تو وہ سلامت تھا۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا گھوڑا ایک بہتے دریا میں پانی پی رہا تھا یا کسی تسلے میں، جو آپ کے پینے پر اسے تنگی ہو جاتی؟ پھر یہ کہ پانی کا گھونٹ لینے میں کتنی دیر لگتی ہے جو آپ کو چلو پھینک کر خیمے کی طرف بھاگنا پڑا، چلو کا پانی پیتے ہوئے بھی بھاگ سکتے تھے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ جب حسین دریا پر پہنچ گئے تھے، حتیٰ کہ اتنا وقت مل گیا تھا کہ گھوڑا سیر اب ہو سکے تو جو لوگ آپ کے خون کے پیاسے تھے، کیا وہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے اور انھوں نے آپ پر تیر برسانے کی بجائے خیمے کی بے حرمتی کے بہانے آپ کو ہٹانا چاہا؟ کتنے بڑے بڑے سوراخ ہیں اس کہانی میں، لیکن ہائے کسی کو نظر نہیں آتا۔

- ابو مخنف کہتا ہے کہ حسین خون میں لتھڑے ہوئے تین گھنٹے تک زمین پر پڑے رہے۔ اتنے میں چالیس آدمی آپ کی طرف لپکے۔ ان میں سے ہر شخص آپ کی گردن کاٹنا چاہتا تھا۔ ایک شخص جو تلوار لیے آپ تک جھپٹ کر پہنچا، وہ شبث بن ربعی تھا۔ وہ جب آپ کے قریب آیا اور گردن کاٹنی چاہی تو حسین نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا، اس نے تلوار پھینک دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا" انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو مجھے رسول اللہ کی سی آنکھیں لگیں اور مجھے شرم آئی کہ رسول اللہ کی سی صورت والے کو قتل کروں۔" کمال ہے، یعنی راوی شبث بن ربعی کو صحابی ثابت کرنا چاہتا ہے جسے حسین کی آنکھ دیکھ کر رسول اللہ کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ گویا اس وقت تک اس نے آپ کے چہرہ پر نگاہ ہی نہیں ڈالی تھی جو رسول سے آپ کی مشابہت نظر آ جاتی، صرف جب سر کاٹنے پہنچا تو معلوم ہوا کہ حسین کی آنکھیں رسول کی سی ہیں۔ خیر، پہلے یہ جان لیجیے کہ شبث بن ربعی نام کے یہ حضرت کون ہیں؟ عہد

نبوی میں موصوف اسلام نہیں لائے تھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی رسول اللہ کو دیکھا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ اسلام لائے لیکن پھر مرتد ہو کر مدعیہ نبوت سجاح کے ساتھ ہوگئے اور اس کے موذن بنے۔ پھر توبہ کی اسلام لائے، بعد ازاں ان لوگوں میں شامل ہوئے جنھوں نے امیر المومنین عثمان پر چڑھائی کی تھی۔ پھر علی کے ساتھ رہے، بعد میں آپ سے بغاوت کر کے خارجی بن گئے تھے، پھر توبہ کی، بعد میں حسین کے خلاف لڑے۔ پھر توبہ کی اور مختار ثقفی نے جب خون حسین کا بدلہ لینے کا دعویٰ کیا تو اس کے ساتھ ہو گئے۔ پھر توبہ کی اور کوفہ کے پولیس میں بھرتی ہوگئے۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیر کی طرف سے مختار سے جنگ کی۔ بعد کی سرگرمیاں معلوم نہیں، غالباً 80 ہجری میں مسلمان ہی مرے۔ (امام بن حجر عسقلانی: تقریب التہذیب)

- اسی طرح ابو مخنف، سنان بن انس کا واقعہ بیان کرتا ہے، کہتا ہے کہ شبث بن ربعی کے بعد سنان بن انس حسین کی گردن کاٹنے کے لیے ان کی طرف بڑھا لیکن اس پر کپکپی طاری ہوگئی اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شمر کے لعن طعن کرنے پر سنان بن انس نے کیا توجیہ پیش کی، وہ بھی ملاحظہ فرمالیں، کہتا ہے: انھوں نے جب میری طرف دیکھا تو مجھے ان کے والد کی شجاعت یاد آگئی اور ان کے قتل کا خیال دل سے نکل گیا۔ باپ کی شجاعت کا خیال کر کے بیٹے کے قتل سے باز رہنا بھی کیا خوب ہے۔ سنان کے نزدیک علی اتنے بہادر تھے کہ انھیں یاد کر کے لوگوں کی عقلیں جاتی رہتی تھیں، گویا ابو مخنف کے نزدیک دلاوری اور شجاعت علی پر ختم ہوگئی تھی۔ ان صحابہ کی کوئی اوقات نہیں تھی جنھوں نے قیصر روم کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے اور مشرق و مغرب میں اسلام کے پھریرے اڑائے۔

- ابو مخنف اب اس جنگ کے کلائمکس پر پہنچتے ہوئے کہتا ہے کہ پھر شمر ذی الجوشن نے ہاتھ میں تلوار لی اور حسین کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس پر حسین کی ہیبت طاری نہیں ہوئی۔ پھر راوی بتاتا ہے کہ سینے پر چڑھے چڑھے دونوں میں باقاعدہ مکالمہ بھی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ابو مخنف بتاتا ہے کہ شمر مبروص تھا، وہ یک چشم تھا، کتے کی طرح اس کی تھوتھنی لعاب سے تر تھی اور اس کے بال خنزیر جیسے تھے۔ کلائمکس کو زیادہ پُر اثر بنانے

کے لیے حسین کا سر یکبارگی ان کے دھڑ سے علیحدہ نہیں کیا گیا بلکہ شمر کے ہاتھوں ان کے ایک ایک عضو کو کاٹنے کا بیان نہایت ہی ہیجان انگیز انداز سے کیا گیا ہے۔ اس درمیان حسین اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے ہائے محمد، ہائے علی، ہائے حسن، ہائے جعفر، ہائے حمزہ، ہائے عقیل، ہائے عباس، ہائے اس طرح قتل ہونا، ہائے مددگاروں کی کمی، ہائے یہ بے وطنی کرتے رہے۔ کیا کہنے ہیں اس منظر کشی کے۔

- پھر صاحبو! ابو مخنف کہتا ہے کہ جیسے شمر نے حسین کا سر کاٹا اور اسے ایک طویل نیزے پر بلند کیا، زمین میں زلزلہ آگیا، مغرب و مشرق میں اندھیرا چھا گیا، لوگوں کو کڑک اور بجلی نے گھیر لیا اور آسمان سے خالص خون کی بارش ہوئی۔ پتہ نہیں یہ غیظ خداوندی اس وقت کہاں اونگھ رہی تھی جب حسین کے عضو الگ کیے جا رہے تھے؟ پھر دلچسپ بات یہ کہ اس بجلی کی کڑک، خون کی بارش اور زلزلے نے دشمنوں کو کیا نقصان پہنچایا، اس بارے میں راوی خاموش ہے۔

- ابو مخنف نے حسین کے بعد حسین کے گھوڑے کو بھی مجاہد اعظم بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عمر بن سعد نے جب حسین کا گھوڑا دیکھا تو لوگوں سے کہا، اسے میرے پاس لاؤ، یہ گھوڑا رسول خدا کے بہترین گھوڑوں میں سے تھا۔ جب لوگ عمر بن سعد کے حکم پر اسے پکڑنے آئے تو اس نے دولتیاں جھاڑنی شروع کر دیں اور بہت سوں کو مار ڈالا، خیر یہ ہوئی کہ ابو مخنف نے اس کے منھ سے رجزیہ اشعار نہ کہلوائے۔ بہر حال، کہا جاتا ہے کہ جب وہ گھوڑا حسین کی لاش پر آیا اور اپنی پیشانی آپ کے خون سے آلودہ کرنے لگا اور ایسے رویا جیسے وہ ماں جس کا بیٹا مر گیا ہو۔ پھر وہ خیمے کی طرف چل پڑا۔ جب زینب بنت علی نے اس کی آہٹ سنی تو سکینہ کی طرف بڑھیں اور ان سے کہا: تمھارے باپ پانی لے آئے۔ سکینہ اپنے باپ کے آنے کا سن کر خوشی خوشی باہر نکلیں۔ اب انھوں نے جو گھوڑے کو تنہا اور زین کو سوار سے خالی دیکھا تو دوپٹہ سر سے اتار کر یوں بین کرنے لگیں؛ "ہائے ابا، ہائے حسین، ہائے مقتول، ہائے بے وطنی، ہائے سفر کی دوری، ہائے بے چینی کی طوالت، حسین جو ادھر پڑے ہیں، ان کا عمامہ اور چادر لوٹ لی گئی۔ ان کی انگوٹھی اور جوتی اتار لی گئی (الخ)۔" اب کون پوچھے کہ یہ جو گھوڑا جسے رسول اللہ کے گھوڑوں میں سے ایک بتایا جا رہا ہے، وہ ساٹھ ستر

برس کا تھا؟ دوسرا سوال یہ کہ کیا خواتین کا خیمہ میدان جنگ سے بیسیوں میل کے فاصلے پر قائم تھے، کیا انھیں اس کی خبر نہ تھی جو میدان جنگ میں ہو چکا تھا یا ہو رہا تھا، جو صرف گھوڑے کی آہٹ پر سمجھیں کہ حسین آگئے اور زین کو خالی دیکھ کر جانا کہ حسین شہید ہو گئے اور یہ بھی جلدی سے دیکھ لیا کہ جسم پر سے چادر، عمامہ اور انگوٹھی لوٹ لی گئی؟

قتال کے بعد

حسین کی شہادت تک جو تماشے آپ دیکھتے چلے آئے، وہ سلسلہ شہادت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ حسین کا سر تن سے جدا کرنا، لاش کے کپڑے، جوتے، ٹوپی وغیرہ لوٹنے کھسوٹنے کے بعد خواتین اور خیمے کے مال واسباب پر جھپٹنا، سروں سے اوڑھنیاں اور چادروں تک کے کھینچ لینے کا بیان ملتا ہے، حتیٰ کہ حسین کی لاش کو روندنے کا "کارخیر" بھی بھرپور طریقے سے انجام دینے کا ایسا بیان ہے کہ آپ "یزید لعنت اللہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے زنجیری ماتم کرنا شروع کر دیں گے۔ لیکن تمام ابواب کی طرح اس باب میں بھی افسانہ نگار صاحب نے عادت سے مجبور ہو کر کہانی میں ایسے ایسے جھول شامل کیے ہیں، جن سے مبالغہ آمیز جھوٹ کا "نورانی چہرہ" آفتاب کو شرما جاتا ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمالیں، چلیے اسی گھوڑے سے شروع کرتے ہیں، جس پر گذشتہ باب ختم ہوا تھا:

- ابو مخنف عبداللہ بن قیس کا حوالہ دیتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نے گھوڑے کو دیکھا کہ وہ خیمے سے واپس فرات کی طرف گیا اور اپنے آپ کو اس میں گرا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ صاحب الزماں کے زمانے میں وہ ظاہر ہو گا۔

گویا امام حسین کے گھوڑے نے خودکشی کر کے حرام موت اختیار کیا، شاید اسے اسلامی شریعت کا پتہ نہ ہو گا۔ خیر، ابو مخنف کی زبان پر "صاحب الزماں" کہاں سے آگیا؟ اس وقت تک تو یہ تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ گوشت پوست کے انسان امام یا مہدی کہلاتے تھے۔ لیکن جب حسن (العسکری) اس دنیا سے لاولد رخصت ہوئے تو ان کے ایک خیالی فرزند کو یہ لقب دیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ تحریک کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے اور اس موہوم ہستی کے نام سے عقائد و اعمال میں ترمیم کی جا سکے اور سیاسی ریشہ دوانیاں ممکن ہو پائیں۔ اس وقت تک اثنا عشریہ نے جن لوگوں کو اپنا امام کہا، وہ سب اپنے اپنے عہد کے خلفا کی بیعت میں تھے اور جماعت کے ساتھ پوری طرح وابستہ تھے۔ حسین کا عبرتناک انجام دیکھ کر حسن العسکری تک ان کے

کسی امام کو خروج کا خیال تک نہ آیا۔ خفیہ ریشہ دوانیوں کی الگ بات ہے، لیکن علانیہ خروج سے سبھی باز رہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ تحریک کو خود اپنے ہاتھوں میں لیا جائے اور سیاسی کاروائیوں کی گنجائش نکالی جائے، سامنے کی مثال خلافت اسلامیہ کو ہلاکو کے ہاتھوں تباہ کروانا ہے۔ خیر، بات کہیں سے کہیں نکل جائے گی، اس پر پھر کبھی تفصیل سے بات ہو گی۔

- ابو مخنف، طرماح بن عدی کے حوالے سے کہتا ہے کہ پھر حسین کی لاش پر نبیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ان کے کپڑے سفید تھے اور مشک وغیرہ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ راوی کے مطابق ان میں سے ایک نبی نے سر کٹی لاش کے پاس بیٹھ کر کوفہ کی طرف اشارہ کیا تو سر وہاں سے آ گیا، جسے انھوں نے حسین کے جسم سے لگا دیا۔ ان نبیوں میں آدم، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ وغیرہ شامل تھے اور لاش پر رسول اللہ بین فرما رہے تھے۔

اب اس جگہ میرا ابلیسی دماغ تو فوراً پہلا سوال یہی کرے گا کہ جب سر جوڑ دیا گیا اور قدرتی طور پر اس سے پیوست ہو گیا تو دوبارہ اسے کس نے کاٹا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا حسین کو شہادت کے بعد عالم ارواح کی طرف عروج نصیب نہیں ہوا جو حسین کو دیکھنے کے لیے رسول اللہ کو انبیا کا قافلہ لے کر عالم برزخ سے عالم ناسوت تشریف لانا پڑا؟

- ابو مخنف کہتا ہے کہ پھر جنوں کا بادشاہ پدھارا، جو بڑی بیچارگی سے کہتا ہے کہ میں اپنی قوم کے ساتھ حسین کی مدد کرنے آیا تھا لیکن ہمیں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی، اس وقت تک حسین قتل کیے جا چکے تھے۔

حالاں کہ جو لوگ جنوں پر یقین رکھتے ہیں، ہم نے ان سے سنا تھا کہ جنوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں انھیں دیر نہیں لگتی، کیوں کہ ان کا وجود ناری ہونے کے سبب فضا میں سرعت کے ساتھ نفوذ کر سکتا ہے اور مادی اشیا ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں لیکن اب یہ جنوں کا بادشاہ بول رہا ہے کہ اس کی فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی؟

- ابو مخنف کہتا ہے کہ حسین کا سر طلوع فجر تک تلاوت کرتا رہا۔ زندگی کے آخری لمحے تک جو شخص ہائے وائے کرتا رہا اور دشمنوں سے زندگی کی بھیک مانگتا رہا، جب اس کا سر تن سے جدا ہو گیا تو کٹا ہوا سر قرآن کی تلاوت کرنے لگا؟

- ایک روایت اور سن لیجیے، علی بن حسین (زین العابدین) جو کربلا میں بیمار ہونے کے سبب میدان جنگ میں نہ نکل سکے تھے، بعد میں حمید بن مسلم کی "عنایت" سے بچ گئے تھے، انھیں قافلہ میں شامل دیکھ کر ابن زیاد کو اس قدر ناگوار ہوا کہ اس نے ان کا ستر کھلوا کر بالغ اور نابالغ ہونے کی جانچ کرائی اور نتیجے میں بالغ پا کر قتل کا حکم دیا، لیکن پھر مختلف روایتوں کے مطابق مختلف وجوہ سے ان کی جان بخشی کر دی۔ (طبری، جلد6، صفحہ 263)

اس بیچارے راوی کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ زین العابدین واقعہ کربلا کے وقت 22 سال کی عمر کے شادی شدہ اور محمد الباقر کے باپ تھے اور دلچسپ بات یہ کہ بچہ بھی قافلے میں موجود تھا۔

ابن زیاد اور حسین کا سر

بہر حال، ہم ان کچھ ناتمام جھلکیوں کے بعد ابن زیاد کے دربار میں پہنچتے ہیں جہاں حسین کا کٹا ہوا سر اسے پیش کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ابن زیاد کے سامنے حسین کا سر پیش کیا گیا تو اس نے ان کے چہرے پر چھڑی مارا۔

بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "فجعل ینکت" (وہ لکڑی سے زمین کریدنے لگا: صحیح بخاری، 3748)

"ینکت" کے معنی، باریک اور چھوٹی لکڑی سے زمین کریدنا ہوتا ہے جو رنج و غم یا تفکر کی علامت ہے۔ لہٰذا ابن اثیر (متوفی 606) کا کہنا ہے؛ "نکت الارض بالقضیب" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لکڑی کے ایک سرے سے زمین کریدے، جیسے رنج و غم کی حالت میں سوچ میں پڑ کر کوئی کرتا ہے اور اسی مفہوم میں حدیث کے الفاظ ہیں؛ فجعل ینکت بقضیب یعنی لکڑی کے ایک سرے سے زمین پر مارنے لگا۔" (النہایہ فی غریب الحدیث 5/113، وانظر لسان العرب؛2/200)

ایک جنازہ میں پیغمبر اسلام کی شرکت سے متعلق حدیث ہے: "فجعل ینکت الارض بعود"؛یعنی آپ لکڑی سے زمین کریدنے لگے۔(صحیح بخاری،4818)

علامہ عینی (متوفی 855) نے بھی بخاری کے اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے یہی کہا ہے؛"بخاری کی حدیث میں (کریدنے لگا) کا مطلب یہ ہے کہ عبید اللہ بن زیاد ایک لکڑی کو زمین پر رکھ کر کریدنے لگا۔"(عمدۃ القاری، شرح صحیح بخاری:16 / 241)

"کریدنے" کے علاوہ بعض روایات میں "اشارہ کرنا" کی صراحت بھی موجود ہے، مثلاً ترمذی دیکھیں: "فجعل یقول بقضیب فی انفہ(یعنی وہ آپ کی ناک کی طرف لکڑی کے اشارہ سے کہنے لگا:ترمذی 3778)

بلاشبہ ابن زیاد ایک سخت گیر حاکم تھا لیکن اصولوں کا پابند تھا جو اس کے منصب کا تقاضہ تھا۔ حسین کے خروج کو روکنا اس کی ذمہ داری تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اتنا بڑا ظالم تھا کہ وہ لاش کی بے حرمتی کرتا۔ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے کہ خود ابو مخنف کے مطابق ابن زیاد نے اس موقع پر حسین کی کنیت سے یاد کیا۔ واضح رہے کہ اہل عرب ازراہ تعظیم کنیت سے یاد کیا کرتے تھے، چنانچہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی فرماتے ہیں:

"اس روایت میں سب باتیں خود سمجھ لینے کی ہیں، مگر ایک نقطہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے یہاں کنیت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب ازراہ تعظیم ہوتا تھا، اسی روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسین کا ذکر آپ کی کنیت ابو عبد اللہ سے کیا ہے اور چھڑی سے کہیں ٹھوکا نہیں دیا ہے بلکہ اشارہ کیا ہے، جو ابن زیاد کے رویے کو کافی مختلف شکل دینے والی بات ہے۔"(واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر، صفحہ 256)

بعض روایات ابن زیاد کا کچھ دوسرا ہی رخ پیش کرتی ہیں، مثلاً:

"حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل آپ کا سر قلم کر کے عبد اللہ بن زیاد کے پاس پہونچا اور کہنے لگا: آج میں اپنی پیالی سونے چاندی سے بھر لوں گا، آج میں نے چھپے ہوئے بادشاہ کا قتل کیا ہے، جو ماں باپ کے اعتبار سے اللہ کے بندوں میں سب سے بہتر تھے۔ یہ سن کر عبید اللہ بن زیاد نے کہا: جب وہ اللہ کے تمام بندوں میں ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بہتر تھے، توتُو نے انھیں قتل کیوں کیا؟ اس کے بعد عبید اللہ بن زیاد نے حکم صادر کیا کہ اس کو آگے لے

جا کر قتل کر دو، چنانچہ اس کی گردن مار دی گئی۔" (العقد الفرید:5/30؛ العواصم من القواصم:240؛الصواعق المحرقہ:5/577؛سمط النجوم:3/385؛مروج الذھب:3/141)

واقعہ کربلا میں ابن زیاد کا رول

سوال اٹھتا ہے کہ پھر واقعہ کربلا میں ابن زیاد کا کتنا ہاتھ تھا؟ میں نے گذشتہ ابواب میں اس پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ ابن سعد کا خط ملنے کے بعد ابن زیاد حسین کی شرائط کو تسلیم کر چکا تھا کہ انھیں دمشق بھیج دیا جائے تاکہ وہ یزید سے بیعت کر سکیں لیکن سابقہ تلخ تجربات کی بنا پر ابن زیاد نے شرط رکھی کہ انھیں پہلے میرے ہاتھ پر بیعت کرنے ہو گی جو خلاف زمانہ بات نہ تھی، خلفا اپنے عمال کے ذریعہ لوگوں سے بیعت لیتے رہے ہیں۔ اسی بات کو حافظ صلاح الدین بھی کہتے ہیں:

"عمر بن سعد نے یہ مطالبے (حسین کی سہ رخی پیشکش) ابن زیاد کو لکھ کر بھیج دیے تاکہ وہ ان کی منظوری دے دے لیکن اس نے سخت رویہ اختیار کیا اور کہا کہ وہ پہلے یہاں میری بیعت کریں، تب میں انھیں یزید کے پاس جانے کی اجازت دوں گا۔ حضرت حسین کی طبع غیور نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: لایکون ذلک ابدا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اس کے نتیجہ میں وہ جنگ شروع ہو گئی۔" (رسومات محرم الحرام، صفحہ 108)

اگر ابن زیاد کا یہ سخت گیر رویہ لائق مذمت ہے تو پھر ابن زیاد ہی کیوں، خود حسین کی ضد بھی قابل مذمت جو اس حادثے کا سبب بنی، لہٰذا حافظ صلاح الدین یوسف پھر آگے لکھتے ہیں:

"حضرت حسین کا ابن زیاد کے انتظامی حکم کے مقابلے میں اپنی عزت نفس اور وقار کو عزیز تر رکھنا، حالاں کہ اگر وہ موقع کی نزاکت اور حالات کی خطرناکی کے پیش نظر تھوڑی سی لچک اختیار کر لیتے تو شاید اس المیے سے بچنا ممکن ہو جاتا۔" (ایضاً، صفحہ 109)

میرا اس پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ جب والی مدینہ ولید بن عتبہ نے حسین کو اپنے پاس بلا کر معاویہ کی وفات اور یزید کی بیعت کا ذکر کیا تھا تو حسین نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ خفیہ طور پر بیعت نہیں کرنا چاہتے بلکہ علانیہ کرنا چاہتے ہیں یعنی ایک روز کی مہلت لے لی۔ سوال اٹھتا ہے کہ وہ دوسرے روز کس کے ہاتھ پر یزید کی بیعت کرنے

والے تھے؟ یزید تو دمشق میں تھا، ظاہر ہے کہ اس کے لیے مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ کے ہاتھوں پر ہی کرتے۔ پھر ابن زیاد کے ہاتھوں پر یزید کی بیعت کرنے میں کیا قباحت تھی؟ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابن زیاد نے حسین کی بدنیتی کا اندازہ بالکل درست لگایا تھا کہ وہ حسب سابق اسے ٹالنا چاہ رہے ہیں جیسا کہ مدینہ میں ولید بن عتبہ کو ٹال کر راتوں رات وہ مکہ فرار ہو گئے تھے۔ اغلب ہے کہ ابن زیاد ایک اصول پسند منتظم ہونے کی حیثیت سے انھیں یہ چھوٹ نہیں دینا چاہتا تھا، یوں بھی ایک حدیث ہے کہ "مومن ایک سوراخ سے دوبار ڈسا نہیں جا سکتا۔"

لہٰذا، یہ حسین کی محض اپنی ضد اور انا کے ساتھ ساتھ ان کی اقتدار کی شدید حرص تھی جو ان کے اور ان کے اہل و عیال کے علاوہ دیگر مسلمانوں کی خونریزی کا سبب بنی۔

راس الحسین

حسین اور تمام مقتولین کے سر کاٹ کر نیزے پر گلیوں گلیوں پھرانے کا تذکرہ عام ہے۔ اس ضمن میں محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب "خلافت یزید و معاویہ" میں ایک دلچسپ بات یہ بتائی ہے کہ ان سروں کی تدفین کی روایات اس درجہ متضاد ہیں کہ یہ خود اپنے جھوٹ کا ثبوت بن جاتی ہیں۔ موصوف نے "ناسخ التواریخ" اور دیگر تصنیفات سے اخذ کر کے جو جدول اپنی کتاب میں درج کی ہے، اسے یہاں پیش کرنا ضروری ہے، حالاں کہ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ سر کے جسم سے جدا کرنے کی روایت متفق علیہ نہیں ہے اور یہ بات درست بھی لگتی ہے چونکہ ایک سر کی تدفین بھلا مختلف مقامات پر کیوں کر ہو سکتی تھی جیسا کہ ذیل میں ان چند مقامات کی نشان دہی کی جا رہی ہے:

1. کربلا: حسین کے صاجزادے علی بن حسین کو ان کے والد اور دوسرے مقتولین کے سر سپرد کیے گئے، انھوں نے چالیس دن بعد کربلا آ کر دفن کیے۔ (ناسخ التواریخ، جلد 2، کتاب دوم، صفحہ 378)
2. مدینہ: عامل مدینہ کے پاس سر بھیج دیا گیا، وہاں بھی دو جگہ تدفین بیان کی گئی ہے؛ یعنی (1) فاطمہ کے پہلو میں جنت البقیع میں (2) اپنے بھائی حسن کے پہلو میں جو قبہ عباس میں مدفون ہیں۔
3. دمشق: تین دن تک دمشق کے دروازہ پر مصلوب رکھ کر باب الفرادیس دمشق میں دفن ہوا۔ (ناسخ التواریخ)

4. عسقلان: دمشق کو جب یہ سر بھیجے جارہے تھے تو وہاں کے عامل نے حسین کا سر لے کر وہیں دفن کر دیا تھا۔ (ایضاً)
5. نجف: ملک شام کو جب یہ سر جارہے تھے تو ایک غلام نے حسین کا سر چرا لیا۔ ناسخ التواریخ، جلد 2، صفحہ 377 میں ہے کہ علی کے پہلو میں دفن کر دیا۔
6. خزانہ یزید میں تیس برس تک محبوس رہ کر مقابر مسلمین میں دفن ہوا: سلیمان بن عبد الملک (متوفی 99ھ) نے خزانہ بنو امیہ سے یہ سر حسب الحکم پیغمبر اسلام جو خواب میں ملا تھا، نکال کر مقابر مسلمین میں دفن کرا دیا۔
7. خزانہ بنو امیہ میں 75 برس محبوس رہ کر کسی میدان میں دفن ہوا: 133ھ میں عباسیوں کی فوج نے جب خزانہ بنو امیہ لوٹا، ایک سپاہی کو ایک تھیلی ملی، کھول کر دیکھا تو پارچہ حریر میں لپٹا ہوا یہ سر تھا اور پارچہ پر لکھا ہوا تھا: "ھذا راس الحسین بن علی"۔ اس نے دیکھتے ہی اسی میدان میں، جہاں تھیلی کھولی تھی، دفن کر دیا۔
8. قاہرہ: تقریباً پانچ سو برس بعد عبیدیوں کے سپہ سالار نے عسقلان سے منتقل کر کے قاہرہ (مصر) میں دفن کرا دیا، جہاں اب مشہد حسین کی عالیشان عمارت ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ صاحب "ناسخ التواریخ" نے یہ ضرور کہا ہے کہ 86 سر چالیس اونٹوں پر لد کر گئے تھے لیکن حسین کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، جوانان بنی ہاشم اور نونہالان اہل بیت کے سروں کے بارے میں تاریخیں کیوں خاموش ہیں؟ ان کے سروں کا آخر کیا ہوا، یہ سب کہاں دفن ہوئے، کس نے دفن کیے، کب دفن کیے؟

باقیات قافلہ سے بد سلوکی

راویوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یزید بن معاویہ نے حکم دیا کہ شہیدوں کے سر اور اہل بیت کو شہر بہ شہر اور گاؤں در گاؤں پھرایا جائے تا کہ شیعان علی عبرت پکڑیں۔ (ناسخ التواریخ، صفحہ 343)

اس کے بر عکس ایک دوسرے شیعہ عالم کا کہنا ہے؛"کوفہ جناب امیر کا دارالسلطنت رہ چکا تھا، باوجود کوفیوں کی اس قدر بے وفائی اور غداری کے اب بھی وہاں ہزاروں ہوا خواہان اہل بیت موجود تھے جو خوف جان ومال و آبرو سے کسی قسم کی جنبش نہ کر سکے، مگر ایسی کاروائی جو خاندان رسالت کی توہین اور تذلیل کو انتہائی حد تک پہنچانے والی تھی، ضرور ان کے لیے اشتعال انگیز اور ہنگامہ عظیم پیدا کرنے والی ہوتی اور کوئی مدبر اور سیاست داں ایسی فاش اور خطرناک غلطی کا، جو عام جذبات کو ہیجان میں لانے والی ہو، ارتکاب نہیں کر سکتا۔"(مجاہد اعظم، صفحہ 286)

اگرچہ موصوف نے صرف کوفہ کے تعلق سے یہ بات کہی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہی سنگین صورت حال تمام مقامات پر پیدا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ یہ سارے قصے محض اختراعی نوعیت کے ہیں جو کافی بعد میں تراشے گئے۔

یزید کے دربار میں

راویوں نے بیان کیا ہے کہ کوفہ سے حسین کا سر یزید بن معاویہ کے پاس دمشق بھیجا گیا اور ساتھ میں حسین کے پسماندگان افراد، خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچا دیے گئے۔ لیکن اس سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ اب تک کے واقعات کے بارے میں خود ایک شیعہ مصنف کا ایک مختصر تجزیہ ملاحظہ کر لیا جائے جنھوں نے مشہور روایات پر درایتاً نظر ڈال کر بہت سی باتوں کو غلط اور مبالغہ آمیز بتایا ہے۔ "مجاہد اعظم" نامی کتاب کا مصنف کہتا ہے:

"اکثر واقعات مثلاً اہل بیت پر تین شبانہ روز پانی کا پانی بند رہنا، فوج مخالف کا لاکھوں کی تعداد میں ہونا، جناب زینب کے صاجزادوں کا نو دس برس کی عمر میں شہادت پانا، فاطمہ کبریٰ کا عقد روز عاشورہ قاسم بن حسن کے ساتھ ہونا، عباس علمدار کا اس قدر جسیم اور بلند قامت ہونا کہ باوجود سواری اسپ ورکابہ آپ کے پاؤں زمین تک پہونچتے تھے، جناب سید الشہدا کے شہادت کے موقع پر آپ کی خواہر گرامی جناب زینب بنت امیر المومنین کا سر و پا برہنہ خیمہ سے نکل کر مجمع عام میں چلا آنا، شمر کا سینہ مطہر پر بیٹھ کر سر جدا کرنا، آپ کی لاش مقدس سے کپڑوں تک کا اتار لینا، نعش مطہر کو لکد کوب سُم اسپان کیا جانا، سرد قات اہلبیت کی غارتگری اور نبی زادیوں کی چادریں تک چھین لینا، شمر کا سکینہ بنت حسین کے منھ پر طمانچہ مارنا، سکینہ کی عمر تین سال کی ہونا، روانگی اہل بیت کے وقت جناب زینب کی پشت پر درے لگائے جانا، اہل بیت رسالت کو بے مقنع وچادر ننگے اونٹوں پر سوار کرنا، سید الساجدین کو طوق وزنجیر پہنا کر ساربانی کی خدمت دیا جانا، علاوہ کوفہ و دمشق کے اثنا راہ میں جا بجا اہل حرم کو نہایت ذلت وخواری سے تشہیر کرنا، مجلس دمشق میں عرصہ دراز تک نبی زادیوں کا قید رہنا، ہندہ زوجہ یزید کا قید خانہ میں آنا یا اس کا اہل بیت کی روبکاری کے وقت محل سرائے شاہی سے سر دربار نکل آنا، سکینہ کا قید خانہ ہی میں رحلت پانا، سید الساجدین کا سرہائے شہدا لے کر اربعین (20 صفر) کو کربلا واپس آجانا اور چالیسویں روز لاش ہائے شہدا کو سپرد خاک کرنا وغیرہ وغیرہ نہایت مشہور

اور زبان زد خاص و عام ہیں، حالاں کہ ان میں سے بعض سرے سے غلط، بعض مشکوک، بعض ضعیف، بعض مبالغہ آمیز اور بعض من گھڑت ہیں۔" (مجاہد اعظم، مولف شاکر حسین نقوی امروہوی، صفحہ 177-178)

دراصل یہ تمام من گھڑت روایات کو وضع کرنے اور انھیں مشتہر کرنے کا سہرا ابن جریر طبری کے سر بندھتا ہے جس نے ابو مخنف اور ہشام کلبی کے اختراعی روایات اور مبالغوں کو کاٹ چھانٹ کر انھیں اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ طبری سے قبل کے مورخ مثلاً امام الفقیہ ابی محمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری (متوفی 276ھ) کی کتاب "المعارف" میں دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ حسین کے تذکرے میں صرف دو سطریں ہیں؛ نہ افواج کی تعداد کا ذکر، نہ معرکہ آرائیوں کا مبالغہ آمیز بیان، نہ پانی کی بندش کا فسانہ اور نہ سر کٹوا کر اس کی تشہیر کرنے کا کوئی شوشہ چھوڑا گیا ہے۔

جب کہ شیعہ روایات کے مطابق اہل بیت اور شہدائے کربلا کے سر دمشق میں غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلت اور تشہیر کے ساتھ لائے گئے اور پھر گھنٹوں انھیں محل کے دروازے پر کھڑا رکھا گیا، پھر ان کی تقریروں وغیرہ کی شکل میں اہل بیت کو خود اپنے ہاتھوں بھی تذلیل اور تشہیر کا سامان کیا گیا، دراصل یہ تمام روایات محض یک طرفہ عقائد اور اعمال و رسوم کو سند پہنچانے کے لیے وضع کی گئی ہیں جن کا تاریخی حقائق سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

یزید کا غیر متوقع ردعمل

گذشتہ ایک باب میں، میں نے ایک روایت بیان کی تھی جس کے مطابق ابن زیاد نے جس آدمی کو حسین کا سر لے کر دمشق بھیجا تھا اور اس نے کربلا کی کہانی سنائی تھی کہ حسین اور ان کے ساتھی ہمارے سامنے ایسے بھاگے جیسے شکروں کے سامنے کبوتر؛ حتیٰ کہ ذرا سی دیر میں ان کا کام تمام کر دیا گیا۔ اسی روایت میں آگے مزید یہ الفاظ بھی شامل تھے:

"پس اب وہاں ان کے جسم ہیں بے لباس، کپڑے ہیں خون آلود، چہرے خاک آلود۔ یہ سن کر یزید کی آنکھیں بھر آئیں اور کہا؛ ارے یہ کیا کیا۔ میں تو قتل حسین کے بغیر بھی تم سے راضی رہتا، اللہ ابن سمیہ کو غارت

کرے، بخدائے پاک میں اگر اس کی جگہ ہوتا تو حسین سے در گذر ہی کرتا۔ اللہ حسین پر رحمت کرے۔ اور پھر اس آدمی کو کوئی انعام وصلہ نہ دیا (جس کا وہ متوقع تھا)۔"

واضح رہے کہ "ابن سمیہ" ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا ہے، یہاں یہ نام کیوں استعمال ہوا، سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر، اس کے بعد راوی بیان کرتا ہے کہ ابن زیاد نے حسین کے اہل خانہ کو دو آدمیوں کی تحویل میں یزید کے پاس بھیجا تھا۔ ان دو میں سے ایک کا نام محضر بن ثعلبہ تھا۔ اس محضر نے محل کے دروازے پر آکر آواز لگائی:

"یہ محضر بن ثعلبہ ہے جو 'ایسوں ایسوں' کو لے کر آیا ہے۔" اس نے 'ایسوں ایسوں' کی جگہ عربی لفظ لئام کا لفظ استعمال کیا جو لئیم کی جمع ہے اور فجرہ کا استعمال کیا جو فاجر کی جمع ہے۔

خیر، اس پر یزید نے جواب دیا؛ "محضر کی ماں نے اس سے زیادہ برا اور اس سے زیادہ لئیم نہیں جنا۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 264)

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ طبری کی یہ روایت درست ہے لیکن مقصد یہ بتانا ہے کہ مختلف اور متضاد روایات کے مجموعے پر کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے؟ دوسری طرف اس روایت کی موجودگی ان روایتوں کو مشکوک ضرور کر دیتی ہے، جن میں یزید کے اس رویے کو برعکس رویہ دکھایا گیا ہے۔

ایک بار پھر سر کی بے حرمتی

محمد باقر کی روایت میں ہے کہ حسین کا سر جب یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپ کے منہ پر چھڑی کا ٹھوکا دیتے ہوئے ایک شعر پڑھنے لگا (طبری، جلد 6، صفحہ 220-221)۔ لیکن یہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا جو گذشتہ باب میں راوی بیان کر چکا ہے، پھر وہی روایت یہاں یزید کے ساتھ جوڑ دی گئی۔ شاید راوی کے حافظہ کی گڑبڑیانیت کی گڑبڑ نے اس روایت کو یزید کے سر بھی مڑھ دیا۔ ابن زیاد کے تعلق سے ہم مختلف دلائل سے بتا چکے ہیں کہ "ٹھوکا" دینے کی بجائے چھڑی سے "اشارہ کرنا" زیادہ قرین قیاس ہے۔

پھر ذرا اس روایت کے تضاد کو دیکھیں کہ قاتل نے حسین کا سر تن سے جدا کیا اور اسے لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے، جب کہ سالار لشکر ابن سعد وہاں موجود تھا، یا تو وہ خود لے کر جاتا یا اپنا کوئی فرستادہ بھیجتا۔

قتل حسین اور خواتین اہل بیت کے ساتھ ذلت و خواری سے پیش آنا وغیرہ کی روایتیں جو طبری میں بھی موجود ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی لیکن انھی کتابوں میں اس کے بر خلاف بلکہ متضاد دوسری روایتیں بھی موجود ہیں، تو کیا ضرور ہے کہ ہم برائی اور بد سلوکی کا معاملہ دکھانے والی روایتیں قبول کر لیں اور ان روایتوں کو رد کر دیں جن کے مطابق یزید نے قافلے کو بہت سارا مال دے دلا کر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا، جن کے احترام اور حفظ مرتبت کے رویہ سے حسینی قافلہ شکر گذار ہوا (تاریخ طبری، جلد 6، صفحہ 266)۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ اس خاندان کے ساتھ مدت العمر یزید کا غیر معمولی مراعات اور حسن سلوک کا رویہ بھی رہا اور پھر ایسا ہی رویہ اہل بیت کا بنو امیہ کے ساتھ بھی رہا۔ اب ذرا اولاد حسین کی ان قرابتوں پر بھی نظر ڈال لیں جو کربلا کے واقعہ کے بعد بنو امیہ سے استوار ہوئیں۔

واقعہ کربلا کے بعد قاتلان حسین سے قرابت داریاں

1. حسین کی مشہور صاجزادی سکینہ نے اپنے شوہر مصعب بن زبیر کے مقتول ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد اپنا نکاح اموی اور مروانی خاندان میں امیر المومنین مروان کے پوتے الاصبغ بن عبد العزیز بن مروان سے کیا جو امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کے بھائی تھے، ان کی کنیت ابو زبان تھی اور ان کی دوسری زوجہ امیر المومنین یزید کی دختر ام یزید تھیں۔ (جمہرۃ الانساب، ابن حزم، صفحہ 96-97؛ کتاب المعارف، ابن قتیبہ، صفحہ 94؛ کتاب نسب قریش، صفحہ 59)

2. دختر حسین، سکینہ کا ایک اور نکاح خلیفہ سوم عثمان کے پوتے زید بن عمر بن عثمان سے ہوا تھا، پھر علیحدگی ہو گئی تھی۔ (المعارف، ابن قتیبہ، صفحہ 93؛ جمہرۃ الانساب، صفحہ 79؛ کتاب نسب قریش، صفحہ 59)

3. حسین کی نواسی زبیحہ بنت سکینہ جو ان کے شوہر عبد اللہ بن عثمان بن عبد اللہ بن حکیم سے تھیں، امیر المومنین مروان کے پروتے عباس بن ولید بن عبد الملک بن مرون کو بیاہی گئیں۔ (کتاب نسب قریشی، مصعب زبیری، صفحہ 59)
4. حسین کی دوسری صاجزادی فاطمہ کا نکاح ثانی اپنے شوہر حسن مثنیٰ کے بعد اموی خاندان میں عبد اللہ بن عمر بن عثمان سے ہوا جس سے حسین کے دو اموی اور عثمانی نواسے محمد اصغر اور قاسم اور ایک نواسی رقیہ پیدا ہوئے۔(جمہرۃ الانساب، صفحہ 76؛ مقاتل الطالبین، صفحہ 180؛ کتاب نسب قریش، صفحہ 59)

5. حسین کے ایک پروتے حسن بن حسین بن علی بن حسین کی شادی اموی خاندان میں خلیدہ بنت مروان بن عنبسہ بن سعد بن العاص بن امیہ سے ہوئی تھی۔ اس امویہ خاتون کے بطن سے حسین کے دو پروتے محمد اور عبد اللہ پیدا ہوئے۔(جمہرۃ الانساب، صفحہ 75؛ کتاب نسب قریش، صفحہ 74)

6. حسین کے ایک پروتے اسحٰق بن عبد اللہ الارقط بن علی بن حسین کی شادی اموی خاندان میں عائشہ بنت عمر بن عاصم بن عثمان سے ہوئی جن کے بطن سے حسین کے عثمانی پروتے یحییٰ بن اسحٰق پیدا ہوئے۔ (جمہرۃ الانساب، صفحہ 47؛ کتاب نسب قریش، صفحہ 65)

7. حسین کے بھائی عباس بن علی کی حقیقی پوتی نفیسہ بنت عباس بن علی کی شادی امیر المومنین یزید کے حقیقی پوتے عبد اللہ بن خالد بن یزید بن معاویہ سے ہوئی۔ اس خاتون کے بطن سے امیر المومنین کے دو پروتے علی اور عباس پیدا ہوئے۔(جمہرۃ الانساب، صفحہ 103؛ کتاب نسب قریش، صفحہ 79)

ان کے علاوہ بھی کئی اور قرابتوں کا ذکر ان کتابوں میں موجود ہے جو کربلا کے واقعہ کے بعد اہل بیت اور امیوں کے درمیان استوار ہوئے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا اہل بیت اتنے بے غیرت تھے کہ قاتلوں کی جماعت کو اپنی بیٹیاں دے کر ان کے ساتھ رشتہ استوار کرتے رہے؟ ظاہر ہے کہ شہدائے کربلا کے پسماندگان سے زیادہ کربلا کے واقعہ سے نہ تو ابو مخنف واقف تھا اور نہ طبری اور نہ دوسرے راویان؛ ورنہ وہ دیدہ و دانستہ

قاتلان حسین سے رشتہ ہی کیوں قائم کرتے؟ کیوں امیوں سے خیر سگالی اور محبت کا رشتہ بر قرار رکھا؟ کیوں اہل بیت نے اس وقت خود کو ان تحریکوں سے علیحدہ رکھا جو قصاص حسین کے نام پر اٹھی تھیں، حالاں کہ یزید اور اس کے حواریوں سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقع تھا لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ اس وقت بھی یزید اور دیگر امی خلفا کی بیعت سے کنارہ کش نہ ہوئے؟ ان سوالوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو کسی دلیل، کسی روایت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بلکہ ہم سیدھا سیدھا واقعہ کربلا ک 1 ی اصل حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔

کربلا سے کتنے مرد زندہ مدینہ لوٹے

یہ غلط فہمی بھی خاصی عام ہے کہ کربلا سے صرف ایک مرد زین العابدین لوٹے تھے جو بیمار تھے اور جنگ میں حصہ نہ لے سکے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ درج ذیل فہرست پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کربلا سے مدینہ آل بیت کے ساتھ کتنے مرد زندہ جاوید لوٹے تھے:

1. علی بن حسین (زین العابدین):22سال
2. حسین الاکبر بن زین العابدین:4سال
3. محمد باقر بن زین العابدین:3سال
4. محمد بن حسین:18سال
5. جعفر بن حسین:14سال
6. عمر بن حسین:(عمر کا پتہ نہیں)
7. زید بن حسن: 30سال
8. حسن مثنیٰ بن حسن:21سال
9. عمرو بن حسن:20سال
10. طلحہ بن حسن:15سال
11. فضل بن عباس بن علی:10سال

12. عبید اللہ بن عباس بن علی: (عمر کیا تھی؟ نابالغ تھے یا بالغ، پتہ نہ چل سکا)
13. حسن بن عباس بن علی: (""")
14. علی بن مسلم بن عقیل: (""")
15. محمد بن مسلم بن عقیل: (""")
16. عبد الرحمٰن بن عبد اللہ اکبر بن عقیل: (""")
17. مسلم بن عبد اللہ اکبر بن عقیل: (""")
18. عقیل بن عبد اللہ اکبر بن عقیل: (""")
19. محمد بن عبد اللہ اکبر بن عقیل: (""")
20. سعید بن عبد الرحمٰن بن عقیل: (""")
21. عقیل بن عبد الرحمٰن بن عقیل: (""")

درج بالا فہرست مختلف کتب انساب کی تصریحات سے ماخوذ ہیں۔ محمود احمد عباسی نے بھی یہ فہرست اپنی کتاب "خلافت معاویہ ویزید" میں شامل کی ہے۔

یزید نے قاتلان حسین کو سزا کیوں نہیں دی؟

یزید بن معاویہ کے خلاف ایک الزام اکثر دہرایا جاتا ہے کہ اگر وہ بے قصور تھا تو اس نے قاتلان حسین کو سزا کیوں نہیں دی؟ اس اعتراض کے جواب میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پورے عالم اسلام میں سے کسی ایک نے بھی یزید سے مطالبہ کیا کہ قاتلان حسین کو سزا دی جائے؟ کیا اہل بیت نے ہی جب وہ یزید کے پاس پہنچے تو انھوں نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا؟ اگر مطالبہ نہیں کیا گیا تھا تو اس سے دو باتیں پیدا ہوتی ہیں:

(1) قاتلان حسین کو سزا دی جا چکی تھی۔

(2) حالات حسین کے خلاف تھے، اس لیے قاتلوں کو سزا دینے کے لیے ساز گار نہ تھے۔

درج بالا دونوں باتوں میں سے خواہ کوئی ایک ہو، بہر حال یزید پر جرم عائد نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو پھر اسی منطق کی رو سے علی بن طالب پر بھی یہی جرم عائد ہوتا ہے جنھوں نے خلیفہ سوم اور داماد رسول عثمان کے قاتلوں کو سزا نہیں دی، جب کہ وہ خلیفہ چہارم بن چکے تھے۔ اس کے بر خلاف علی نے تو قاتلین عثمان کو عہدے عطا کیے، گورنری عطا کی، کیا اس طرح علی بن طالب، یزید بن معاویہ سے زیادہ بڑے مجرم قرار نہیں پاتے؟

واضح رہے کہ قتل حسین کے بالکل بر عکس، قتل عثمان کا قصاص لینے کے لیے مطالبہ بھی ہوا تھا، لیکن اگر کوئی یہ عذر پیش کرتا ہے کہ علی کے سامنے کوئی مجبوری تھی جس کے سبب وہ قاتلان عثمان کو سزا نہ دے سکے، تو پھر یہ رعایت آپ یزید بن معاویہ کو کیوں نہیں دینا چاہتے؟

کچھ لوگ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ یزید کو اہل مدینہ اور اہل مکہ پر حملہ کی طاقت تھی تو پھر قاتلان حسین سے قصاص کی طاقت کیوں کر نہ تھی؟ جواب ایک بار پھر وہی ہے کہ علی ابن طالب کو جنگ جمل اور جنگ صفین پر حملہ کی طاقت تھی تو قاتلین عثمان کے خلاف کاروائی کرنے کی طاقت کیوں کر نہ تھی؟

مدینہ پر حملہ

یہاں ابھی ابھی ایک ذکر مدینہ کی حرمت کی پامالی کا آگیا، چلیے اسے بھی نمٹا لیتے ہیں۔ بے شک یہ بات درست ہے کہ اہل مدینہ کی بغاوت پر فوجی طاقت استعمال کی گئی لیکن اس میں یزید کا قصور کیا ہے؟ یزید نے تو اہل مدینہ کے ساتھ وہی کیا جو اس سے قبل علی بن طالب نے اہل جمل و صفین کے ساتھ کیا تھا۔ واضح رہے کہ جمل و صفین کے خلاف علی کی کاروائی کو یہی مسلمان بر حق بتاتے ہیں اور ان کے مخالفین کو "اجتہادی غلطی" کا مرتکب بتلاتے ہیں۔ لیکن سوال اٹھتا ہے کہ آپ اسی نقطہ نظر سے یزید کا معاملہ کیوں نہیں دیکھتے؟ اہل مدینہ نے یزید کی بیعت توڑ دی، اسے بھی ان کی "اجتہادی غلطی" تصور کر لیجیے، پھر یزید نے انھیں بہت سمجھایا لیکن جب وہ نہ مانے تو مجبوراً اسے فوجی طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ جمل و صفین کے خلاف علی بن طالب فوجی طاقت کا استعمال کر سکتے تھے تو یزید بن معاویہ اہل مدینہ کے خلاف کیوں نہیں کر سکتا؟ میرے خیال میں یزید نے تو علی کے نقش قدم کی پیروی کی۔ یہاں واضح رہنا چاہیے کہ علی نے جمل اور صفین کے جن لوگوں پر حملہ کیا تھا، وہ اہل مدینہ سے کہیں گنا افضل و بہتر تھے جن پر یزید

نے حملہ کیا۔ اہل مدینہ میں سے جس گروہ نے یزید کی مخالفت کی تھی، اس گروہ میں ایک بھی صحابی کی شمولیت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ عبد الملک بن حسین العصامی المکی (متوفی 1111) کہتے ہیں:

"یزید کی بیعت توڑنے میں اہل مدینہ کی موافقت کبار صحابہ میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کی تھی۔ (سمط النجوم العوالی فی انبا الاوائل والتوالی: 3/202)

صحیح بخاری کی روایت بھی ملاحظہ فرمالیں:

"نافع روایت کرتے ہیں کہ جب اہل مدینہ نے یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں اور بچوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ہر وعدہ توڑنے والے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ اور ہم اس (یزید) کی بیعت اللہ اور اس کے رسول کے موافق کر چکے ہیں، میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی بے وفائی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کی بیعت اللہ اور اس کے رسول کے موافق ہو جائے، پھر اس سے جنگ کی جائے۔ تم میں سے جو شخص یزید کی بیعت توڑے گا، اور اس کی اطاعت سے روگردانی کرے گا تو میرا اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ (صحیح بخاری، 7111)

مکہ پر حملہ

جہاں تک مکہ پر حملہ کرنے کا تعلق ہے تو ہم سب جانتے ہیں کہ عبد اللہ بن زبیر کا یزید سے سخت اختلاف تھا جس کے نتیجہ میں اہل شام نے ان کے خلاف کاروائی تھی اور اسی دوران کعبہ جل گیا تھا، لیکن اسے اہل شام نے جلایا تھا، یہ ثابت نہیں ہے، دونوں طرح کی روایات موجود ہیں، حسن لغیرہ کی روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن زبیر اور ان کے ساتھی کعبہ کے ارد گرد آگ جلا رہے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے آگ کعبہ تک پہنچ گئی اور اس کا کچھ حصہ جل گیا۔ (مجلہ السنہ، نمبر 15، صفحہ 13)

یہاں واضح رہنا چاہیے کہ اہل شام کو یہ کاروائی عبد اللہ بن زبیر کے معارضہ کی وجہ سے کرنی پڑی تھی، جس کی تائید صحابہ نے بھی کی۔ صحابی رسول ابو برزۃ الاسلمی نے کہا: "اور وہ جو مکہ میں ہیں، عبد اللہ بن زبیر؛ وہ بھی صرف دنیا کے لیے لڑ رہے ہیں۔" (صحیح بخاری، کتاب الفتن، 7112)

اسی طرح صحابی رسول عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے بھی عبد اللہ بن زبیر سے کہا؛ "اے ابن زبیر! آپ حرم میں فساد و الحاد سے بچیں۔" (مسند احمد: 2/219)

اسی طرح عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، جندب بن عبد اللہ اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے بھی ابن زبیر کے اقدام کی مذمت کی، حتیٰ کہ عبد اللہ بن عمر تو ابن زبیر اور ان کے رفقا کو باغی سمجھتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ میں نے ان سے قتال کیوں نہ کیا، کیوں کہ باغیوں کے خلاف لڑنے کا حکم ہے۔ تو پھر جس کام کی تمنا عبد اللہ بن عمر جیسا جلیل القدر صحابی کر رہا تھا، وہی کام اگر اہل شام نے کیا تو کیا بُرا کیا؟

القصہ، اگر یزید کی مخالفت میں چند لوگوں کے نام پیش کیے جاتے ہیں تو اس سے وہ برا ثابت نہیں ہو جاتا، کیوں کہ علی کی مخالفت تو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے کی جن میں ام المومنین عائشہ بھی شامل تھیں۔ اگر اس کے باوجود ہم علی کو ہدف تنقید نہیں بناتے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم گنتی کے چند لوگوں کی مخالفت کی بنیاد پر یزید پر لعن طعن کریں؟

یزید کی موت

ابو مخنف نے یزید کی موت کی وجہ گھوڑے سے گرنا بتایا ہے، حالاں کہ ایک شہسوار کے لیے ایسی موت باعث توقیر ہی ہوتی لیکن افسوس یہ حقیقت نہیں ہے۔ یزید بن معاویہ کا انتقال 14 ربیع الاول، 64 ہجری کو نواح دمشق میں ہوا، وہ نقرس کے مرض میں گرفتار تھا۔ بوقت وفات اس کی عمر 42 سال تھی۔ یزید کی وفات حوارین میں ہوئی، نماز جنازہ اس کے فرزند معاویہ ثانی نے پڑھائی۔ تدفین دمشق کے مقبرے باب الصغیر میں ہوئی، یہیں اس کے باپ معاویہ بھی مدفون ہیں۔

ساری زندگی اسلامی فتوحات کے لیے یہ نوجوان سرگرم رہا اور آخر زمانہ میں مضافات دمشق میں اس نے زراعت کی ترقی اور باشندوں کی آب رسانی کے لیے اپنی ذاتی نگرانی میں جبل قاسیوں سے نہر جاری کروائی جو "نہر یزید" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک شیعہ مورخ امیر علی اپنی کتاب "ہسٹری آف ساریسنز" کے صفحہ 153 پر رقم طراز ہے:

"دمشق میں آب رسانی کا انتظام ایسا ہے کہ مشرقی ممالک میں اب تک کوئی اس پر سبقت نہ لے جاسکا اور بنی امیہ کے حکمرانوں کی انمٹ یادگار ہے۔ آج کے دن تک بھی کم حیثیت گھر کے اندر فوارہ پانی کا موجود ہے جو بلاشک خاندان بنو امیہ کے سلاطین کا رہین منت ہے۔"

شیعہ مورخ نے بانی نہر کے نام کو چھپا کر سلاطین بنی امیہ کہا ہے۔ یزید دشمنی میں تو شیعہ نہر یزید کے پانی سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ بہر حال اس نہر کی وجہ سے یزید کو لقب "المہندس" سے معاصرین نے نوازا تھا۔

اختتامیہ

یونانی اور ہندی اساطیر میں مغلوب و محکوم سورماؤں کے محیر العقول واقعات پر فخر و غرور اور ان کے کامیاب دشمنوں پر سب و شتم اپنے جذبات کی تسکین کے لیے عام ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن نے ان اساطیری قصوں پر جو تبصرہ کیا ہے، کم الفاظ میں اتنا جامع اور متنوع تبصرہ ممکن نہیں، آپ بھی لطف اٹھائیں:

"قصوں کے پرانے مجموعے کیا ہیں شہد کی مکھی کے چھتے ہیں۔ کہانیوں میں کہانیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ جو حظ اٹھایا وہ نوش ہے۔ جو عبرت حاصل ہوئی وہ نیش ہے۔ جو لطف بہم پہنچا وہ تہ دار ہے۔ جو سبق ملا وہ دو جمع دو چار نہیں۔ معنویت کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ جوابوں میں خود سوال پنہاں ہیں۔ کہانیاں کہنے والوں کے پیشِ نظر کیا کیا معنی تھے، ہمیں نہیں معلوم۔ یہ کہانیاں کسی طرح ہم تک پہنچ تو گئیں لیکن مرورِ ایام سے معنویت کی بعض سطحیں گھس پس کر معدوم ہو چکیں۔"

کربلا کی داستان بھی عہد بہ عہد سفر کرتے ہوئے ایک اساطیری قصہ کا روپ دھار چکی ہے۔ اس واقعہ کی جڑ "استحقاق خلافت" کا مسئلہ ہے۔ علی ابن طالب اور حسین بن علی دونوں خلافت کو اپنے گھر کی لونڈی تصور کرتے تھے، جو اصولاً غلط تھا۔ قرآن نے صاف صاف اس "استحقاق" کو نہایت ہی واضح انداز میں رد کر دیا ہے:

مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيماً

[نہیں ہیں محمد باپ کسی کے تمہارے مردوں میں سے بلکہ وہ رسول اللہ ہیں اللہ کے اور سلسلہ نبوت کی تکمیل کرنے والے ہیں اور ہے اللہ ہر چیز سے باخبر۔] (سورۃ احزاب، آیت نمبر 40)

اگر علی اور حسین اپنی شخصی فضیلت اور اہلیت کی بنا پر رائے عامہ کی حمایت کے دعویدار تھے تو پھر تاریخ بھی ان کے اس دعوے کو خارج کرتی ہے۔ آخری وقت تک علی بن طالب کی خلافت کی آئینی حیثیت معرضِ بحث رہی

اور نصف سے زیادہ امت مسلمہ آپ کے خلاف تھی۔ حسن بن علی نے قوت رکھنے کے باوجود خلافت سے دستبردار ہو کر خود ہی ثابت کر دیا کہ وہ اس استحاق کے اہل نہیں ہیں۔ مزید آگے بڑھیے، آل علی میں سے ڈھائی سو برس میں 65 لوگوں نے حصول خلافت کے لیے خروج کیا لیکن ان میں سے کسی کو بھی اتنے حمایتی میسر نہ ہو سکے کہ حکومت وقت کا تختہ الٹا جا سکے، ہمیشہ نتیجہ وقتی اور محدود اختلال کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ ان میں سب سے بڑا خروج حسین بن علی کا تھا جس کے نتائج آج تک مسلمان بھگت رہے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ حسین بن علی اور ابن زبیر کے اقدامات امت کی فلاح و بہبود کے لیے تھے اور وہ مذہب اسلام کی سلامتی کے لیے چاہتے تھے کہ سیاسی نظام میں تبدیلی لائیں، چونکہ یزید سے بیعت قواعد شرعیہ کے تحت ناجائز تھی، تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان جلیل القدر صحابہ (اس وقت 300 سے زیادہ صحابہ مدینہ و مکہ اور دوسرے مقامات پر موجود تھے) کو قواعد شرعیہ کا علم نہ تھا، جنھوں نے رسول اللہ سے دین براہ راست سیکھا، جنھوں نے عہد نبوت میں دین کی حفاظت کے لیے ساری دنیا سے جنگ مول لی تھی، غزوات اور جہادوں میں پیش پیش رہے تھے، کیا ان کے مقابلے میں حسین اور ابن زبیر کو دین کی حفاظت کی فکر زیادہ تھی یا ان کے مقابلے میں تجربہ زیادہ تھا؟ کیا حسین کو کاروبار مملکت چلانے کا کوئی عملی تجربہ تھا؟ ان کی ڈھلتی جوانی تک کسی خلیفہ نے انھیں کوئی منصب نہیں دیا تھا، جس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ امور جہانبانی سے انھیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ خود ان کے باپ امیر المومنین علی ابن طالب نے ایروں غیروں کو اور اپنے قریب ترین عزیزوں کو مناصب تقسیم کیے لیکن ان میں حسین کا نام کہیں نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ جمل اور صفین تک میں بھی انھوں نے کوئی معرکہ آرائی نہیں کی، حالاں کہ ان کے چھوٹے بھائی محمد بن حنفیہ کے ہاتھ میں ایک دستے کی کمان تھی۔ اس کے برخلاف یزید بن معاویہ سالہا سال تک ولی عہد مسلمین کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرتا چلا آرہا تھا، جہاد میں نمایاں حصہ لیا کرتا تھا اور غزوۂ قسطنطنیہ میں اس کی قیادت اور فتح یابی تو سامنے کی بات ہے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ یزید کو متعدد معارک و جہاد میں بھیجنے اور جزائر بحر ابیض و بلاد ہائے ایشیائے کوچک فتح کرنے، حتیٰ کہ خود استنبول (قسطنطنیہ) پر بری افواج سے حملہ کرنے وغیرہ میں آزمایا جا چکا تھا۔

ایک سوال اور اٹھتا ہے کہ بالفرض سیاست میں ناتجربہ کاری کے باوجود حسین بن علی اور ابن زبیر دین کی بنیاد پر یزید کے خلاف تھے اور بقول ان کے یزید کے تقرر کے سبب دین اسلام کی گاڑی پٹری سے اتر گئی تھی تو ان دونوں صاحبان میں باہمی تعاون کیوں نہ تھا؟ دونوں نے مل کر گاڑی کو دوبارہ پٹی پر لانے کی کوشش کیوں نہ کی؟ ایک دوسرے کے حریف کیوں بنے رہے؟ اگر واقعی یہ دونوں حضرات اپنی سوچ میں مخلص تھے اور جمہور صحابہ و جماعت المسلمین کا فیصلہ ان کے نزدیک باطل تھا تو پھر ان دونوں کے درمیان پورا اتحاد ہونا چاہیے تھا یا کم از کم وقتی طور پر سہی، انھیں اپنے ذاتی اختلافات کو پس پشت ڈال کر یزید بن معاویہ کی حکومت کے خلاف مشترکہ محاذ بنانا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، کیوں؟ یہ کیسا اختلاف تھا کہ وہ خود کسی متفق علیہ نصب العین پر متحد نہ ہو سکے؟

ان سب سے زیادہ بڑا سوال تو یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ 300 سے زائد صحابہ میں سے کسی ایک نے بھی یزید کی مخالفت نہیں کی اور حسین کا ساتھ نہ دیا؟ اگر حسین واقعی دین اسلام کے تحفظ کے لیے خروج پر آمادہ ہوئے تھے تو کیوں ان کے چچا، بہنوئی اور ان کے بھائیوں نے انھیں روکنے کی کوششیں کیں؟ کیوں اہل عراق، جن کے بھروسے پر انھوں نے یہ اقدام کیا تھا، وہ بھی ان کی ہمنوائی پر تیار نہ ہوئے؟ مزید یہ کہ واقعۂ کربلا کے بعد مسلمانوں کے نظم و نسق میں کوئی خلل کیوں نہ پڑا؟ اس واقعہ کے بعد بھی امت ویسی ہی رہی جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہ ہو۔

جب مغیرہ بن شعبہ، جن کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے، نے یزید کی ولیعہدی کی تجویز امیر المومنین معاویہ کے سامنے رکھی تو وہ فوراً مان نہیں گئے بلکہ ایک تجربہ کار اور دور اندیش سیاست داں کی طرح انھوں نے عالم اسلام کے نمائندوں سے اجلاس میں مشورہ طلب کیا اور یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔ ابن کثیر کے الفاظ ہیں؛ "فاتسنقت البیعۃ لیزید فی سائر البلاد و فدت الوفود من سائر الاقائیم الی یزید۔ "(البدائیہ والنہایہ، جلد 8، صفحہ 80)

معاویہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے رکھا۔ بتایا جاتا ہے کہ مدینہ میں یہ اجتماع اتنا مہتم بالشان تھا کہ اس سے پہلے ایسا شوریٰ کبھی نہ ہوا تھا۔ اس اجتماع میں اصحاب بدر سے لے کر اصحاب بیعت الرضواں تک موجود تھے، حتیٰ کہ کعب بن عمرو بھی وہاں تشریف رکھتے تھے۔ اس اجتماع میں کئی سو صحابہ موجود تھے۔ اس وقت متعدد امہات المومنین بھی زندہ تھیں۔ ان سب نے اس تجویز کی تائید کی۔ اگر اتنی کثیر تعداد میں

کبار صحابہ اور امہات المومنین کی رضامندی کے علاوہ تمام عالم اسلام کا ووٹ بھی یزید کی خلافت کے حق میں تھا تو پھر دو چار لوگوں کا اختلاف آئینی اور اخلاقی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

حسین اور ابن زبیر گورنر مدینہ سے صبح کو بیعت کرنے کا وعدہ کر کے راتوں رات مدینہ سے فرار ہو گئے تھے، اگر یزید بن معاویہ کو حسین یا آل بیت سے پرخاش ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم جاری کرنا کون سا مشکل تھا کہ حسین کا سر کاٹ کر اس کے پاس بھیج دیا جائے؟ اس وعدہ خلافی کے باوجود حسین مکہ میں ایک دو روز نہیں، بلکہ چار ماہ مقیم رہے لیکن ان پر حکومت نے کوئی پابندی عائد نہیں کی، کوئی باز پرس نہ کی۔ حالاں کہ حسین کی خفیہ سرگرمیاں جاری رہیں، لیکن کیا حکومت ان سے انجان تھی؟ اسے آپ یزید بن معاویہ کی اعلیٰ سیاسی تربیت کا نمونہ نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے، جو ان لوگوں کو اس وقت تک چھیڑنا نہیں چاہ رہا تھا، جب تک وہ ایک جتھا بنا کر حکومت کے مقابلے پر عملاً کھڑے نہ ہو جائیں۔

واقعہ کربلا کے تعلق سے جو دو باتیں اہم ہیں، ان میں سے ایک جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ یزید بن معاویہ کی بیعت پر حسین نے رضامندی ظاہر کر دی تھی اور دمشق کی راہ پکڑ لی تھی۔ پھر ابن زیاد نے آپ کے رشتہ دار عمر بن سعد کو کہا کہ وہ پہلے ابن زیاد کے ہاتھوں پر بیعت کر کے اس کی توثیق کریں، اس پر حسین نے کہا کہ اس سے تو موت بہتر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی بات پر جنگ چھڑی۔ کچھ لوگ ابن زیاد کو مطعون کرنے کے لیے بڑی دلچسپ بات کہتے ہیں کہ کہاں رسول اللہ کے فرزند اور کہاں ابن مرجانہ۔ سوال اٹھتا ہے کہ صحابہ کرام جیسی بڑی شخصیتوں نے اپنے اپنے علاقے کے والیوں سے بیعت کی تھی یا نہیں؟ ایسی بیعت تو تمام عالم اسلام سے لی جا چکی تھی۔ ابن زیاد کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کا مطلب یزید کی بیعت تھی، نہ کہ ابن زیاد کی۔ ابن زیاد کسی شخصی بیعت کا طلب گار نہیں تھا بلکہ حکومت وقت کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے وہ اس کا طالب تھا۔ یہ اس کی دور اندیشی بھی تھی، کیوں کہ حسین کا سابقہ ریکارڈ خراب تھا، وہ مدینہ کے والی سے وعدہ کر کے مکہ ایک بار فرار ہو چکے تھے، اس کی کیا ضمانت تھی کہ وہ یزید کے ہاتھوں بیعت کرنے کا وعدہ کر کے ایک بار پھر ٹال مٹول سے کام نہیں لے رہے تھے؟

دوسری بات جو اہم ہے، وہ یہ کہ حسین جب دمشق روانہ ہو گئے تو حکومت کا جو دستہ آپ کے ساتھ گامزن تھا، اس نے مطالبہ کیا کہ آپ اپنے ہتھیار حکومت کے سپرد کر دیں تا کہ حکومت مطمئن رہے۔ کہتے ہیں، جنگ اس پر

چھڑی۔ یہ مطالبہ بھی جائز تھا، اگر آپ پُر امن طور پر دمشق جارہے تھے تو پھر ہتھیار کی ضرورت کیوں تھی؟ آخر حسین کو انھیں سپرد کرنے میں کیا اور کیوں اعتراض تھا؟ ہم اس نکتہ پر بھی حوالہ دے چکے ہیں کہ یزید کے پیامبر نے کبوتر اور شکرے کی مثال دے کر کیا کہا تھا۔

اب ان دونوں نکات کو ذہن میں رکھیں تو مطلع صاف ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا ہو گا۔ میں اس مکمل داستان کے تجزیہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، ان قوی امکانات کو مختصر میں یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

کربلا کی اصل کہانی

حسین ابن علی اپنے بڑے بھائی حسن بن علی کے برعکس، لیکن اپنے باپ علی ابن طالب کے موافق ایک ابن الوقت اور طالع آزما شخص تھے، مزید یہ کہ وہ ناعاقبت اندیش بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے برعکس اپنے باپ کے عبرت ناک انجام سے کوئی سبق نہیں لیا جو مرتے وقت اپنے بڑے بیٹے کو وصیت کر جاتا ہے کہ معاویہ سے صلح کر لینا اور ان کے امیر المومنین ہو جانے سے کراہت مت کرنا۔ لائق بیٹے نے وہی کیا لیکن چھوٹے بیٹے حسین ابن علی نے جب سیاست کے انھی سنگلاخ راستوں پر قدم رکھنے کی کوشش کی تو بڑے بھائی نے سختی سے ٹوکا، حتیٰ کہ انھیں زنجیر پہنانے کی دھمکی تک بھی دے ڈالی۔ چھوٹے بھائی نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی لیکن سینے کے اندر حب جاہ و منصب کی آگ جلتی رہی، جس نے بڑے بھائی کی موت کے بعد شعلۂ جوالا کا روپ دھار لیا۔ اس جلتی پر تیل کا کام ان خوشامدیوں اور ان کے خطوط نے کیا جنھوں نے حسین کی خود پسندی اور خودسری کو ہوا دے کر ان کے سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی بچی کھچی صلاحیت کو بھی معطل کر دیا۔ لہٰذا، حسین کو اپنے وہ رشتہ دار اور خیر خواہ بھی دشمن نظر آنے لگے جو انھیں اس اقدام سے روکنا چاہتے تھے۔ بہر حال، حسین باقاعدہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر مع اہل و عیال کوفہ کی سمت روانہ ہوئے، چونکہ ان کے ایجنٹ مسلم بن عقیل نے تصدیق کر دی تھی کہ یہاں ہزاروں لوگوں نے ان کی غائبانہ بیعت کر لی ہے۔ حکومت وقت جس نے اب تک حسین کی بزرگی کا خیال رکھتے ہوئے ان کی خفیہ سرگرمیوں پر کوئی باز پرس نہیں کی تھی اور اب تک جس نے ان پر مشتبہ افراد سے ملنے پر پابندی بھی عائد نہیں کی تھی، وہ حسین کی اس عملی بغاوت پر حرکت میں آگئی۔ آدھے سے زیادہ سفر طے کرنے کے بعد حسین کو جب پتہ چلا

کہ پانسہ پلٹ چکا ہے، ان کے خوشامدیوں نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لیے ہیں اور ان کا ایجنٹ مارا جا چکا ہے تو ان کے ہاتھوں سے طوطے اُڑ گئے اور ان کے خوابوں کا شیش محل وہیں زمین بوس ہو گیا۔ ڈھلتی عمر کی اس منزل میں حسین کو لگنے والا یہ صدمہ کافی کاری تھا، لیکن اب تک ان کے اندر وہ خود پسندی اور انانیت زندہ تھی جو بچپن سے ان کی شریک سفر رہی تھیں اور جو اب تک ان کی شناخت بن چکی تھیں۔ اسی دوران باغیوں کو کوفہ کے حدود میں داخل ہونے سے پہلے اور راستے میں ہی ان پر قابو پانے کے لیے سرکاری پولیس کی ایک ٹکڑی وہاں پہنچ گئی۔ اپنی خوشنما امید کے برعکس حسین کی آنکھوں کے سامنے اب بھیانک صورت حال تھی، لہٰذا آپ نے حق و باطل کے فلسفہ اور دین اسلام کی آبیاری جیسے خوب صورت نعروں پر دو حرف بھیج کر حکومت کے سامنے سپردگی کے لیے تین شرطیں رکھیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ یزید کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کو تیار ہیں، انھیں اس کے پاس دمشق بھیج دیا جائے۔ ظاہر ہے حکومت کو اور کیا چاہیے تھا، لہٰذا اب قافلہ کا رخ کوفہ کی بجائے دمشق کر دیا گیا، جس کی راہ میں کربلا بھی پڑتا ہے۔ جب نمائندۂ حکومت ابن زیاد کو خبر ملی کہ حسین، یزید کی بیعت کرنے کو تیار ہیں، بلکہ انھوں نے کوفہ جانے کا راستہ چھوڑ کر دمشق کا راستہ بھی اختیار کر لیا ہے تو اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن حفظ ماتقدم اور سابقہ تلخ تجربات کے تحت اس نے اپنی جانب سے یہ شرط عائد کی کہ حسین پہلے حکومت کے نمائندہ ابن زیاد کے ہاتھوں پر بیعت کر کے اپنے اس نئے فیصلے کی تصدیق کر دیں، تاکہ حکومت کو اطمینان ہو جائے کہ حسین مدینہ سے راتوں رات مکہ فرار ہونے والی حرکت کا اعادہ نہیں کریں گے، ساتھ ہی اس نے یہ مطالبہ بھی رکھا ہو گا کہ جب حسین یزید کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کو تیار ہی ہیں تو پھر انھیں ہتھیار surrender کر دینے چاہئیں، جیسا کہ عموماً آج بھی دنیا کی ہر حکومت باغیوں اور دہشت گردوں سے سب سے پہلا مطالبہ یہی کرتی ہے۔ ابن زیاد کا یہ فرمان لے کر قاصد اس وقت پہنچا جب قافلہ کربلا پہنچ چکا تھا۔ امیر ابن سعد نے جب حسین کو ابن زیاد کی شرطیں سنائیں تو ان کی آبائی نخوت اور خود پسندی ایک بار پھر ان کے احساس شکست پر غالب آگئی۔ حسین نے ان دونوں شرطوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسی صورت حال میں ظاہر ہے کہ سرکاری عمال ابن سعد اور اس کے سپاہیوں نے اس باغی قافلہ کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا ہو گا یا ان پر قابو پانے کی کوشش کی ہو گی، نتیجتاً حسینی قافلے کے سورما بمع حسین ابن علی مزاحمت

کرتے ہوئے ان پر جھپٹ پڑے ہوں گے اور چشم زدن میں یہ تماشہ ختم ہو گیا جیسا کہ درج ذیل اقتباس میں بھی اس جانب واضح اشارہ موجود ہیں:

"گورنر (کوفہ) عبید اللہ ابن زیاد کو یزید نے حکم دیا تھا کہ (حسینی قافلہ کے) ہتھیار لے لینے کی تدابیر کرے اور (صوبہ) عراق میں ان کے داخل ہونے اور جھگڑا اور انتشار پھیلانے سے باز رکھے۔ کوفہ کے شیعان علی میں سے کوئی بھی (مدد کو) کھڑا نہ ہوا۔ حسین اور ان کے مٹھی بھر متبعین نے اپنے سے بدرجہا طاقتور فوجی دستہ پر، جو ان سے ہتھیار رکھوا لینے کو بھیجا گیا تھا، غیر مآل اندیشانہ طور سے حملہ کر دیا۔" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، صفحہ 1162)

پھر طبری کی اس روایت کو بھی دیکھیے، جس میں ابن زیاد نے جس شخص یعنی زحر بن قیس کو حسین کا سر لے کر یزید کے پاس بھیجا تھا، اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کیا کہا:

"امیر المومنین مژدہ ہو، اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کا۔ حسین بن علی اپنے اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (اس خبر پر) ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے پر چھوڑ دیں ورنہ قتال کے لیے تیار ہوں۔ ان لوگوں نے قتال پسند کیا۔ نتیجہ میں ہم لوگوں نے سورج نکلتے ہی ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا، حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کو کھوپڑیوں پر کام شروع کیا تو جدھر منہ اٹھا بھاگ پڑے، کہیں ٹیلوں کی، کہیں گڑھوں کی پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ پس اے امیر المومنین قسم ہے خدا کی ہمیں ان کا خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ وقت نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے۔" (طبری، جلد 6، صفحہ 264)

درج بالا روایت سے ہم مبالغہ نکال دیں تو اس روایت کا خلاصہ بس اتنا ہی تو ہے کہ سپاہیوں نے حسینی قافلے سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا، انکار کرنے پر جب سپاہیوں نے ان پر قابو پانے کی کوشش کی تو حسینی قافلے کے سورما ان پر جھپٹ پڑے لیکن سپاہیوں کی معقول تعداد (ہزاروں نہیں بلکہ شاید دو چار سو رہے ہوں گے) ان پر غالب آ گئی اور حسین ان کے رفقا کے ساتھ ساتھ مارے گئے، واضح رہے کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سرکاری سپاہی بھی تقریباً اسی تعداد میں مارے گئے جو اس بات کو نشان زد کرتا ہے کہ وہ سپاہی جنگ کے لیے نہیں، صرف ہتھیار ڈلوانے کے

لیے گئے تھے۔ پھر ذرا ان 21 زندہ مردوں کی فہرست یاد کیجیے جو بخیر و عافیت کربلا سے مدینہ لوٹے تھے، ظاہر ہے جنھوں نے ہتھیار ڈال دیے یا فرار ہو گئے، ان کی جان بچ گئی۔ اگر سرکار یا سرکاری پولیس کی نیت حسین کے تمام لوگوں کو ختم کرنے کی ہوتی تو بھلا وہاں انھیں روکنے والا کون تھا؟ عورت، بچے، بیمار سب کو وہ قتل کر سکتے تھے؟

واقعہ کربلا کی کہانی بس اتنی سی ہے، جسے میں نے صرف دو پیراگراف میں سمیٹ دیا ہے لیکن لوگوں نے اس پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے ہیں۔ لاکھوں کی فوج، تقریروں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ، بندش آب، مبارزت طلبی، رجزیہ کلمات پڑھ پڑھ کر خون گرمانے کی کوشش، سینہ پر چڑھ کر سر کو جسم سے جدا کرنا، نیزوں پر سروں کی نمائش، خواتین آل بیت کی بے حرمتی، انھیں شہروں شہروں پھرانا، حسین کے سر کی بے حرمتی، سکینہ کی بالیوں کو چھیننا، زینب کا بے چادر ہو کر سینہ کوبی کرنا وغیرہ وغیرہ، ساری کہانیاں بعد کے عہد کی اختراع ہیں، جو سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے وضع کی گئیں۔ ان اساطیری قصوں اور روایات نے شہادت ناموں، شعلہ بیان خطیبوں، ذاکروں، نوحہ خوانوں اور مرثیہ گویوں کے وہ ریوڑ پیدا کیے ہیں جن کی گلہ بانی کی ذمہ داری مسلکی سیاست نے اپنے سر لے رکھی ہے۔

شروع سے لے کر آخر تک ہم نے صرف بلا تفریق مسلک مسلم مورخین و محدثین کی روایات اور اقتباسات کے سہارے حقائق کی چھان پھٹک کی ہے، لیکن اتمام حجت کے طور پر یہاں ایک مستشرق کے نتیجۂ فکر سے بھی استفادہ کرنے کا جی چاہتا ہے۔ ڈوزی رین ہارٹ (Dozy Reinhart Pieter Anne) اپنی کتاب "Spanish Islam: A History of the Moslems in Spain" میں واقعہ کربلا پر اپنے تاثرات کو صرف ایک مختصر سے پیراگراف میں سمیٹتے ہوئے کہتا ہے:

"اخلاف کا یہ عموماً شعار رہا ہے کہ وہ ناکام مدعیوں کی ناکامی پر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات انصاف، قومی امن اور ایسی خانہ جنگی کے ہولناک خطروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ابتدا میں نہ روکی گئی ہو۔ یہی کیفیت اخلاف حسین کے متعلق ہے، جو ان کو ایک ظالمانہ جرم کا کشتہ خیال کرتے ہیں۔ شدید ایرانی تعصب نے اس تصویر میں خد و خال بھرے، حسین کو بجائے ایک معمولی قسمت آزما کے جو انوکھی لغزش و خطائے ذہنی اور قریب

قریب غیر معمولی حب جاہ کے سبب ہلاکت کی جانب تیزی سے رواں دواں ہوں، ولی اللہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں اکثر و بیشتر انھیں ایک دوسری نظر سے دیکھتے تھے۔ انھیں عہد شکنی اور بغاوت کا قصور وار خیال کرتے تھے، کیوں کہ انھوں نے معاویہ کی زندگی میں یزید کی ولیعہدی بیعت کرلی تھی اور اپنے حق و دعوائے خلافت کو ثابت نہ کر سکے تھے۔"(صفحہ 127، مطبوعہ لندن 1913)

شاید ہمارے مومنین ایک مستشرق کے نام پر ناک بھوؤں سکوڑیں کہ وہ تو دشمن اسلام ہوتے ہیں، تو چلیے آخر میں یہی بات ہم مصری مورخ الخضرمی کی زبان سے سن لیتے ہیں جنھوں نے اپنی معروف تالیف "محاضرات تاریخ الاسلامیہ "میں لکھا ہے:

" حسین نے اپنے خروج میں بڑی شدید غلطی کا ارتکاب کیا جس سے امت میں تفرقہ اور اختلاف کا ایسا وبال پڑا کہ الفت اور محبت کے ستون آج تک متزلزل ہیں۔ اس حادثہ کو اکثر مورخین نے اس انداز سے پیش کیا ہے، جس سے ان کا مقصد لوگوں کے دلوں میں بغض کی آگ بھڑکانا ہے۔ واقعہ تو صرف اتنا ہی تھا کہ ایک شخص (یعنی حسین ابن علی) حکومت کی طلب میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے جن اسباب و اعوان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ فراہم نہیں کر سکتا اور بغیر امر مطلوبہ حاصل کیے قتل ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے والد (علی ابن طالب) بھی قتل ہو گئے تھے۔ لکھنے والوں کے قلم روکے نہیں جاسکتے، انھوں نے حسین کے قتل کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، جس سے عداوت کی آگ بڑھتی گئی۔"(جلد اول، صفحہ 32)

سید امجد حسین کی تصنیفات

قرآن اور اس کے مصنفین

اعجاز القرآن: ایک تنقیدی مطالعہ

کب کا ترک اسلام کیا

جنگ بدر: کیا حقیقت کیا فسانہ

معراج امجدیہ

واقعہ کربلا: چور مچائے شور